Regd. A466

سرد جبرائے ۴۶۶

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰؍

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینوالی انجیل انسانیت

من و یزدان

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:- اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور ہارون حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۶۲۴ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مفتاین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت چار روپیہ
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے۔
علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور افسانہ لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے نیا اڈیشن قیمت چار روپیہ
علاوہ محصول

"نگار" کا جو پرچہ آپ کو نہ ملے گا وہ دوبارہ بیرنگ روانہ کیا جائیگا
اور
آپ کو ۳/ ادا کرنا پڑیں گے

ہر مہینے نگار نہایت احتیاط سے ہر خریدار کے نام روانہ کیا جاتا ہے پھر بھی بعض پرچے ڈاک کی بدنظمی یا مقامی ڈاکیوں کی غفلت سے گم ہو جاتے ہیں - ہم کو جب اس کی اطلاع ملتی ہے تو ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے لیکن اس کا کوئی علاج نہیں اس سے پہلے ہم اطلاع ملنے پر دوبارہ پرچہ روانہ کر دیا کرتے تھے، لیکن اب محکمۂ ڈاک کے جدید قواعد کی رو سے نگار کی تاریخ اشاعت ہر ماہ کی سات مقرر کر دی گئی ہے اور اس کے بعد ایک پیسہ کی جگہ ہم کو ڈیڑھ آنے کا ٹکٹ لگانا پڑے گا۔ لیکن اگر اسے برداشت کر لیا جائے تو بھی یقینی نہیں کہ پرچہ دوبارہ آپ کو مل جائے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ پرچہ بیرنگ روانہ کیا جائے جو تین آنے ادا کرنے پر آپ کو ملے گا، اس طرح پرچہ آپ کو یقینی مل جائے گا۔

آپ اپنے مقامی ڈاک خانہ اور پوسٹ مین کو بھی ہدایت کرتے رہئے کہ وہ احتیاط سے آپ کی ڈاک آپ تک پہونچاتا ہے تاکہ اس کی نوبت ہی نہ آئے کہ پرچہ آپ کو نہ پہونچے اور دوبارہ بیرنگ وصول کرنا پڑے۔

منیجر

پاکستان کے خریدارانِ نگار

اپنا چندہ آٹھ روپیہ چھ آنے (چھ آنے زاید سالنامہ کے رجسٹرڈ بھیجنے کے ہیں) ذیل کے پتوں میں سے کسی پتہ پر بھیج کر منی آرڈر ہمارے پاس بھیجدیں — اگر آپ نے ۶/ زاید نہ بھیجے تو ہم سالنامہ کے پہونچنے کے ذمہ دار نہ ہوں گے اور دوبارہ مفت روانہ نہ کر سکیں گے۔ اور پھر ساڑھے تین روپیہ آپ کو روانہ کرنا ہوں گے۔ سالنامہ ۵۴ء، چندہ وصول ہونے کے بعد ہی روانہ ہوگا۔

۱- ڈاکٹر ہاشمی - ۲۲۲ - الٰہی بخش کالونی کراچی —— ۲- ملک دین محمد اینڈ سنز بُل روڈ لاہور

"فرمانروایانِ اسلام نمبر" مفت

اس سالنامہ کی قیمت معہ محصول تین روپیہ آٹھ آنہ ہے لیکن آپ کو اس کی ایک زاید کاپی بالکل مفت مل سکتی ہے، اگر آپ ایک نیا خریدار فراہم کر کے، اُس کا چندہ بھی اپنے چندہ کے ساتھ معہ مصارف رجسٹری (جملہ سولہ روپیہ بارہ آنے) بذریعہ منی آرڈر روانہ فرماویں -

منیجر نگار لکھنؤ

"نگار" جنوری، فروری ۵۴ء کی مشترکہ اشاعت

(فرمانروایانِ اسلام نمبر)

جن خصوصیات کا حامل ہوگا، ان کو مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ یہ ایک دائرۃ المعارف ہے جس کے مطالعہ کے بعد آغاز عہد نبوی سے اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے متعلق آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ وہ کب، کہاں اور کن حالات میں قایم ہوئیں، ان کے عروج و زوال کے کیا اسباب تھے، ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں کیونکر منتقل ہوئیں، ان کے فرمانرواؤں کے کیا نام تھے اور ان میں سے ہر ایک نے کس سنہ سے کس سنہ تک حکومت کی۔

اس سالنامہ میں دو نقشے ایسے بھی شامل ہوں گے جو پورے سالنامہ کا نچوڑ ہیں اور جن کو دیکھ کر بیک نگاہ اسلامی حکومتوں کے عروج و زوال کی پوری تصویر آپ کے سامنے آجائے گی۔

قیمت فی کاپی علاوہ محصول تین روپیہ۔ سالانہ خریدارانِ نگار کے لئے مُفت، لیکن چھ آنے زاید مصارف رجسٹری کے لئے آنا ضروری ہیں۔

منیجر نگار

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۵۳ء میں ختم ہو رہا ہے

تو مناسب یہی ہے کہ آپ جنوری ۵۴ء میں سالنامہ کی وی پی کا انتظار کریں جو آٹھ روپے آٹھ آنے میں روانہ ہوگا لیکن اگر آپ چندہ پیشگی بھیجنا مناسب سمجھتے ہیں تو ازراہ کرم منی آرڈر آٹھ روپیہ چھ آنے کا روانہ فرمائیے تاکہ سالنامہ ذریعہ رجسٹری روانہ کیا جائے، ورنہ گم ہونے کی صورت میں ہم دوبارہ اسے مُفت روانہ نہ کر سکیں گے۔ اور پھر آپ کو ساڑھے تین روپیہ صرف کرنا ہوں گے۔

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۵۳ء میں ختم نہیں ہوتا

تو سالنامہ ۵۴ء کو ذریعہ رجسٹری بھیجنے کے چھ آنے ضرور بھیجدیجئے خواہ ٹکٹوں کے ذریعہ سے، خواہ ذریعہ منی آرڈر، لیکن لفافہ کے اندر رکھے ہوئے ٹکٹ ممکن ہے ہمیں نہ مل سکیں اور منی آرڈر کا پہونچنا یقینی ہے۔

سالنامہ اگر گم ہوگیا اور آپ کو نہ ملا تو دوبارہ ہم اسے مُفت روانہ نہ کر سکیں گے اور پھر آپ کو ساڑھے تین روپیہ صرف کرنا ہوں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ دسمبر میں ختم ہوگیا اور جنوری کا
"نگار" آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں وی، پی ہوگا

نگار

جس میں سالنامہ ۵۴ء کی قیمت بھی شامل ہے

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۴ | فہرست مضامین دسمبر ۱۹۵۳ء | شمار ۶

ملاحظات ---------- نیاز --- ۳
ن کی سیاسیات حاضرہ کا اہم ترین پہلو --- ایران دوست - ۵
ہ گرد اشعار --- پروفیسر عطاء الرحمان کاکوی - ۳۱
یٹ حکومت کی علمی و ذہنی ترقیاں --- نیاز --- ۳۳
ان سے کہدو ---------- انور اعجاز ---- ۳۷
ے گا ہے بازخواں ---------- نیاز -- ۴۳

مکتوبات نیاز ---------- نیاز ---------- ۴۶
کوزہ و دریا ---------- نیاز ---------- ۴۹
دعوتِ نقد و نظر ---- پروفیسر عطاء الرحمٰن ---- ۵۰
اعتبارات ---------- نیاز ---------- ۵۲
منظومات --- شمیم نہازی - اختر انصاری - فضا ابن فیض اعظمی -
ساقی جاوید - قہر اکبر آبادی ---------- ۵۴

ملاحظات

ستورِ پاکستان اور قرآن و سُنّت

بہرکار، پاکستان کے ارباب فکر و سیاست نے "دستورِ پاکستان" بنانے کا فیصلہ کر ہی لیا اور اپنے پندار میں پاکستان کی مسلم آبادی کو مطمئن بھی کر دیا کہ اُس کی بنیاد "قرآن و سنت" پر ہوگی

پاکستان کے اس اعلان کا ردِّ عمل ہندوستان اور دُنیا کے دوسرے ممالک پر کیا ہوگا، اسپر فی الحال غور کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جب دین کر سامنے نہ آجائے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی نوعیت واقعی کیا ہوگی، خود پاکستان پر اس کا ردِّ عمل کیا ہوگا، اور مسلمان کس حد تک ان ویلات غیر شرعیہ کو گوارا کر سکیں گے، جو شریعتِ قرآنی سے ہٹ کر وضعِ دستور کے جواز کے لئے پیش کی جائیں گی

پاکستان کے اس اعلان کا وہ ٹکڑا جو ہمیں اس نوع کے اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا رکھنے کا ذمہ دار ہے یہ ہے کہ مالیاتی قانون میں پچیس سال تک کسی قسم کا کوئی رد و بدل نہ ہو سکے گا اور موجودہ تعزیراتی قانون میں بھی فی الحال کوئی تبدیلی نہ ہوگی گویا بالفاظ دیگر مفہوم یہ ہوا کہ آن کا اسلامی دستور جس کی بنیاد "قرآن و سنت" پر ہوگی فی الحال ۲۵ سال تک معرضِ التوا میں رہے گا اور اس کے بعد اس کی تشکیل پر وگا اگر وقت و زمانہ نے اجازت دی ـــــ وقت و زمانہ کی قید میں نے لگائی ہے ـــ کیونکہ میں جانتا ہوں جن اسباب کی بنا پر اس وقت ی دستور کے نفاذ کو ملتوی کیا جا رہا ہے وہی اسباب پچیس کیا سو سال کے بعد بھی باقی رہیں گے اور نہیں کہا جا سکتا کہ پاکستان کے مسلمان تک اسی طرح کی غیر مسلمانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور رکھا جائے گا

اس میں شک نہیں پاکستان کو وضع دستور کے باب میں بڑی دشواریوں کا سامنا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ "مردی و نامردی" کے درمیان جو ایک قدم کا فاصلہ ہے، اسے کیونکر طے کرے

پاکستان بننے سے پہلے اور اس کے بعد بھی ہر ہر قاید و رہبر کی زبان سے "قرآن و سنت" کا لفظ اتنی بار نکل چکا ہے کہ ایک طرف وہ اس سے ہٹ کر کسی دوسرے نظام حکومت کا نام لینے کی بھی ہمت و جرأت نہیں کر سکتا اور دوسری طرف وہ یہ بھی پوری طرح محسوس کرتا ہے کہ صحیح معنے میں وہ کوئی ایسا اسلامی دستور بنا ہی نہیں سکتا جو بین الاقوامی سیاسیات و اقتصادیات میں اسے دوسرے ممالک کے دوش بدوش رہنے میں معاون ہو سکے

قرآن و سنت کے احکام بعض مسایل میں اس قدر واضح و روشن ہیں کہ نہ ان کی کوئی تاویل ہو سکتی ہے، نہ انھیں توڑ مروڑ کر کسی دوسری شکل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے، مثلاً تعزیراتی احکام کے سلسلہ میں چور کا ہاتھ کاٹ ڈالنا، زانی کو سنگسار کرنا، شارب خمر کے کوڑے لگانا، سود کے لین دین کو یک لخت بند کر دینا، احتکار (غلہ جمع کرنے) کو مستوجب سزا قرار دینا ـــــ اور ظاہر ہے کہ پاکستان ان پر عمل کرنے کے لئے کبھی طیار نہ ہوگا، کیونکہ ان میں سے بعض احکام ایسے ہیں، جو بین الاقوامی مصالح کے پیش نظر جاری نہیں ہو سکتے اور بعض ایسے ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو اس کی اقتصادی ساکھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور بالکل مفلوج ہو کر رہ جائے

ان حالات کے پیش نظر پاکستان نے غالباً یہی مناسب سمجھا کہ ایک طرف تو وہ "قرآن و سنت" کا نام لے کر وقتی طور پر عوام کو مطمئن کر دے اور دوسری طرف ۲۵ سال کی فرصت حاصل کر کے، آخری و قطعی فیصلہ کو مستقبل پر چھوڑ دے

بظاہر پاکستان کی یہ تدبیر بڑی دانشمندانہ معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے اس باب میں دو ٹوک فیصلہ نہ کر کے اتنی بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور ممکن ہی نہیں

اگر واقعی اس کا ارادہ یہی تھا کہ وہ پاکستان کو "اسلامی جمہوریت" قرار دے کر وہاں اس شریعت کا نفاذ کرے جو قرآن و سنت سے مستنبط ہو سکتی ہے، تو پھر اس کو بلا پس و پیش ایسا کر دینا چاہئے تھا اور تمام بین الاقوامی روابط، اور جملہ اقتصادی مصالح کو قربان کر کے، موجودہ دفاتر میں آگ لگا کر، اپنی تاریخ بالکل نئے ورق سے شروع کر دینا چاہئے تھی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا، اور نہ کرنا چاہتا تھا ـــــ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف دنیا اس کی بین الاقوامی سوجھ بوجھ کی طرف سے مایوس ہو گئی، ہمسایہ ملکوں کے دلوں میں اوہام و شکوک پیدا ہونے لگے اور دوسری طرف خود پاکستان کے مسلمانوں میں بھی اختلاف پیدا کر کے ایک اور اندرونی خلفشار اپنے لئے پیدا کر لیا، کیونکہ ایک طرف وہاں کی سرمایہ دار جماعت، وہاں کا جاگیردارانہ نظام، وہاں کا تجارتی حلقہ اب یا کبھی موجودہ بین الاقوامی مالیاتی نظام میں کوئی تبدیلی گوارا نہیں کر سکتا اور دوسری طرف وہاں کا طبقۂ عوام جو مُلّائیت کے زیر اثر فوری نفاذ شریعت چاہتا ہے، اسکی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آ سکتی کہ جو فعل شرعاً و مذہباً ممنوع ہے اس کو کیوں نہ فوراً روکا جائے اور کسی خاص مدت تک جایز و مباح قرار دینے کے کیا معنی ہیں، اسی کے ساتھ انھیں کیونکر یقین آئے گا کہ ۲۵ سال کے بعد واقعی وہ سب کچھ ہو سکے گا، جس کا وعدہ اس وقت کیا جا رہا ہے اور اس دوران میں وہ کونسی تدابیر اختیار کی جائیں گی جو اسلامی دستور کے نفاذ کو مالیاتی یا اخلاقی حیثیت سے آسان تر بنا دیں گی

اس وقت دُنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے وہ ساری دُنیا سے تجارتی، مالی و ثقافتی تعلقات ختم کر کے زندہ رہ سکتا ہے (یہاں تک کہ امریکہ بھی اگر ایسا چاہے تو ممکن نہیں) اس لئے وہ پاکستان ہو یا کوئی اور ملک اس کے زندہ رہنے کی اولین شرط یہ ہے کہ وہ ان قواعد و اصول سے انحراف نہ کرے جو مختلف اقوام و ممالک نے باہمی تعاون کے لئے وضع کر لئے ہیں اور یہ وہ اُصول ہیں جن پر خالص اسلامی نقطۂ نظر سے کبھی عمل نہیں کیا جا سکتا

بہر حال پاکستان کا اعلان مسئلہ دستور میں بڑا غیر مدبرانہ اعلان ہے اور اندیشہ ہے کہ مبادا اس کی دشواریاں کم ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ جائیں۔

ایران کی سیاسیات حاضرہ کا اہم ترین پہلو

ایرانی وزیر اعظم ڈاکٹر مصدّق کا عروج و زوال

(بہ سلسلۂ ماسبق)

ہ اور مصدّق کے اختلافات

فروری ۱۹۵۲ء سے ایرانی پارلیمنٹ کی سترھویں مجلس کا انتخاب شروع ہوا۔ مصدّق کی نہضت ملی پارٹی کے امیدواروں کے علاوہ کچھ افراد ایسے بھی منتخب ہوئے جو اگرچہ دوسری ں سے تعلق رکھتے تھے مگر تیل کے معاملہ میں بہ حیثیت مجموعی مصدّق کی پالیسی کے حمایتی تھے۔ جب مجلس کی ۱۳۶ نشستوں میں سے اُنا سی ارکان کا انتخاب ہوگیا تو مصدّق نے بقیہ امیدواروں کے حمایتیوں کے درمیان جھگڑے فساد برپا ہو جانے کی وجہ سے الکشن ملتوی کر دیا۔ صف سے زیادہ نشستوں کا انتخاب ہو چکا تھا، اس لئے ۲ اپریل کو مجلس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مصدّق نے دستور کے مطابق شاہ کو اپنا استعفا یا۔ پھر نئی مجلس کی بھاری اکثریت نے دوبارہ مصدّق کو وزیر اعظم منتخب کیا لیکن سینٹ (دارالامراء) مصدّق کے انتخاب کے حق میں نہ تھی۔ اس

ایرانی پارلیمنٹ کے دو ایوان ہیں "مجلس شورائے ملی" یعنی دارالعوام ۔ اور سینٹ یا سنا یعنی دارالامراء ۔ مجلس کی مجموعی عضویت (Members) ایکسو چھتیس ۱۳۶ ہے۔ سنا کی ساٹھ ۶۰ ۔ سنا کے تینس ۳۰ ممبروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ بقیہ تینس ۳۰ کو بادشاہ نامزد کرتا ہے۔ سنا کی حیثیت "دائمی ایوان" اور ہر دوسرے سال اس کے نصف ممبر بدل دئے جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی قرعہ کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ مجلس کا انتخاب ہر دو سال کے بعد ہوتا ہے یہ انتخاب ں چلتا رہتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کل اثنائے مجلس کا انتخاب مقررہ وقت کے اندر انجام پا جائے۔ اگر نصف سے زیادہ ممبر چُنے جا چکے ہیں تو پھر غیر معمولی ں کے پیدا ہو جانے پر الکشن روک بھی دیا جا سکتا ہے۔

ایرانی الکشن پر ہمیشہ سے مقامی اصطلاح میں "قلابی" (Jarea) ہونے کا الزام لگایا جاتا رہا ہے۔ مخالف پارٹیوں کو ہمیشہ یہ شکوہ رہا ہے انتخابات آزادانہ اور بے لاگ نہیں ہوا کرتے۔ حکومتِ وقت اور پولیس کے حکام اس کے انتظام و انصرام میں بے جا مداخلت کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ز" اور "امراء" جس کو چاہتے ہیں اُس کا انتخاب ہو جاتا ہے۔ صوبائی انتخابات میں گورنروں کی طرف سے اس طرح کی دست اندازی اور بھی ہوا کرتی ہے۔

ایرانی الکشن کی تاریخ میں انتخابات کے قانون کو باضابطہ اور مرتب بنانے کے لئے سب سے پہلا قدم ڈاکٹر مصدّق نے اُٹھایا۔ اگرچہ اُس کے عہدِ حکومت انتخابات کو بھی پوری طرح آزادانہ نہیں کہا جا سکتا ۔ اہم ملکی مسایل کے متعلق ووٹ لینے کے لئے ضروری ہے کہ مجلس میں ممبروں کی تعداد کورم پورا کے لئے نصف سے زیادہ موجود ہو۔ اس کورم کی موجودگی کے بغیر جلسہ کی کوئی کارروائی جایز و موثر نہیں سمجھی جا سکتی۔ دارالامرا (سنا) کی منظوری کے بغیر مجلس کا کوئی فیصلہ یا پاس کیا ہوا بل قانون نہیں بن سکتا۔

کابینہ کے وزراء سنا یا مجلس کے ممبر نہیں رہ سکتے۔ سنا یا مجلس کا کوئی رکن اگر وزارت کا عہدہ قبول کر لیتا ہے تو پھر ان دونوں ایوانوں میں سے جس کا ہ ممبر ہو، اُس سے مستعفی ہو جانا اُس کے لئے ضروری ہے ۔ سنا اور مجلس دونوں کے انحلال کا حق شاہ کو ہے۔ اس طرح وزیر اعظم کے تقرر اور معزولی کا اختیار بھی شاہ کے ہاتھ میں ہے۔ معمولی حالات میں شاہ تمام معاملات میں سنا اور مجلس کی متفقہ رائے پر عمل کرتا ہے اور یہ اتفاق رائے لازمی ہے۔ وزیر یا دفاع کا انتخاب بھی ہمیشہ سے شاہ کے اشارہ سے ہوتا آیا ہے۔

موضوع پر شاہ، سنا اور مجلس کے ممبروں کے درمیان ہفتوں بحثیں چلتی رہیں۔ سنا پر حملہ کیا گیا کہ وہ کبھی مصدق جیسے قوم پرست کا ساتھ نہیں دے سکتی وغیرہ وغیرہ بالآخر قوی فشار کے تحت سنا کو بھی یہ انتخاب تسلیم کرنا پڑا۔ دونوں ایوانوں کی منظوری کے بعد شاہ نے ۱۰ر جولائی کو مصدق کے نام وزیر اعظم کے عہدہ کا فرمان صادر کر دیا۔ ڈاکٹر مصدق نے اپنی حکومت بنائی اور ۱۲ر جولائی ۵۲ء کو اپنے وزراء کابینہ کا نام پیش کرنے کے لئے شاہ سے ملاقات کے وقت مصدق نے شاہ سے خلاف توقع یہ درخواست کی کہ وزیر اعظم کے عہدہ کے علاوہ وزارت جنگ کا قلمدان بھی اسی کے سپرد کیا جائے تمام ملک میں مصدق کی ہر دلعزیزی کا جو حال تھا اُس کے پیش نظر اس التماس کا قبول کرنا خود شاہ کے لئے خطرہ سے خالی نہ تھا اور ہمیشہ سے یہ عہدہ شاہ کے کسی معتمد خاص کو ملا کرتا ہے۔ شاہ نے مصدق کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ مصدق نے گورنمنٹ چلانے سے انکار کر دیا اور اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گیا۔ شاہ تو مصدق کی بڑھتی ہوئی قوت سے خایف تھا ہی، اس نے اس موقع سے زیادہ سے زیادہ فایدہ اُٹھانے کی کوشش کی نہضت ملی کے ممبروں کو چھوڑ کر مجلس کے بقیہ ارکان نے جب یہ دیکھا کہ مصدق اپنی شرط پر اڑا ہوا ہے تو انھوں نے ایک پرائیویٹ جلسہ بلایا اور ایران کے پچاسی سالہ بوڑھے سیاست داں آقا احمد قوام[1] کو مصدق کی جگہ ملک کا وزیر اعظم انتخاب کر لیا۔ شاہ نے فوراً اس انتخاب پر قبولیت کی مہر لگا دی لیکن نہضت ملی پارٹی نے قوام کے انتخاب کو "قطعاً ناجایز اور ناقابل قبول" قرار دیا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ "اس انتخاب میں مجلس کے بنیادی قانون کے خلاف عمل کیا گیا ہے" ایرانی قانون کے مطابق مجلس شوریٰ ملی کا وہی فیصلہ جایز سمجھا جا سکتا ہے جس میں مجلس کی مجموعی تعداد (ایکسو چھتیس) میں نصف سے زیادہ (یعنی کم از کم ستر) ارکان ووٹ کے وقت موجود ہوں۔ لیکن اس موقع پر مجلس کے "خفیہ جلسے" میں صرف بیالیس ارکان موجود تھے جنھوں نے قوام کے حق میں ووٹ دئے تھے اور نہضت ملی کے بقیہ اٹھائیس ممبران مجلس نے اس "خصوصی و خفیہ" جلسہ میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ایرانی پارلیمنٹ کے اس عجیب و غریب قانون یعنی کورم مکمل نہ ہونے کی بنا پر قوام کا انتخاب باطل اور غیر قانونی ٹھہرا دیا گیا، اگرچہ شاہ کا فرمان صادر ہو چکا تھا۔

اکیس جولائی کا انقلاب۔ عوام کی فتح

۱۹ر جولائی کی صبح کو قوام السلطنت نے وزیر اعظم کی حیثیت سے ایک بیان دیا جو اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں نشر ہوا۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

"بڑھاپے کی مصیبت اور آرام کی اگزیر ضرورت کے باوجود اعلیٰ حضرت کے فرمان کے مطابق حکومت کی صدارت کا بھاری بوجھ اپنے کمزور کاندھوں پر اُٹھا رہا ہوں۔ ملک کے آشوب اور بدنظمی کو دیکھتے ہوئے ایک سچے وطن پرست کے لئے ممکن نہیں کہ خاموش کھڑا مملکت کی تباہی اور بدبختی کا تماشا کرتا رہے۔

پچھلے ایک برس سے تیل کے مسئلہ نے ملک میں آگ بھڑکا رکھی ہے۔ آج ہر طرف ملک میں بے چینی اور ابتری پھیلی ہوئی ہے اور اس سرزمین کا ایک دل بھی خوش و خرم نہیں ..... ڈاکٹر مصدق نے تیل کے تصفیہ کے سلسلہ میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے کچھ ایسا ڈھنگ اختیار کر رکھا ہے کہ ہمیں کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہونچا سکتا .....

میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میری نظر میں خارجی ملکوں سے اچھے تعلقات کی بڑی اہمیت ہے۔ خصوصاً دنیا کے بڑے ملکوں سے میں اپنی اس خارجی پالیسی کی راہ میں کسی کا ناجائز اور مہمل فشار اور دباؤ برداشت نہیں کروں گا .....

ملک کے امن و نظم کو برقرار رکھنے کے لئے میں شورش و بلوا کرنے والوں کے ساتھ سختی سے پیش آؤں گا۔ داخلی اصلاحات کی طرف توجہ کرنے

---

[1] احمد قوام متعدد بار ایران کا وزیر اعظم رہ چکا ہے ۱۹۴۶ء میں صوبہ آذربیجان کے سلسلہ میں اُسے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ جنگ دوم کے دوران میں ایران کا جنوبی علاقہ انگریزوں کے کنٹرول میں تھا اور شمالی روسیوں کے۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد انگریزوں نے تو اپنی فوجیں جنوب سے ہٹا لیں لیکن روسی شمال میں جمے رہے۔ احمد قوام اسی زمانہ میں ایران کا وزیر اعظم تھا۔ یو۔ ان۔ او کے دباؤ اور فشار سے روسی اُس علاقہ سے چلے تو گئے لیکن کہا جاتا ہے کہ ایک شخص غلام یحییٰ پشاوری نے انکی حمایت اور مدد سے ایران کے شمالی صوبہ آذربائیجان میں ایک آزاد ریپبلک بنائی اور خود اس کا صدر بن بیٹھا۔ قوام نے پشاوری کے خلاف فوجکشی کی۔ وہ شکست کھا کر بھاگا اور آذربائیجان دوبارہ ایران میں شامل کر لیا گیا۔

پہلے امن وامان کا قیام بالکل ضروری ہے۔ اس لئے تمام لوگوں کو چاہئے کہ وہ قانون کے سامنے سر تسلیم خم کردیں اور بغیر چون وچرا ت کے احکام کی اطاعت کریں — میں ملک کے تمام باشندوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ نافرمانی اور ہرج ومرج کا دور ختم ہوا اور اب ت کے احکام کی اطاعت کا زمانہ ہے —"

اس وقت ایران "اغیار دشمنی" اور قوم پرستی کے جن غیر معتدل اور مجنونانہ جذبات سے متاثر تھا۔ ان کے مقابل اس طرح کا تند بیان نہ تھا نہ پسندیدہ۔ ظاہر تھا کہ اس اعلان کے پیچھے ایک فرسودہ اور بعد از جنگ کے حالات سے بے خبر دماغ کام کر رہا تھا۔ ایک ماغ جو تدبر و وقت شناسی سے زیادہ زور اور طاقت کا معتقد ہے۔ مزید یہ کہ ایسے نازک وقت میں "بڑے ملکوں" کے متعلق ایسا ہوا اظہار ارادت بھی نفسیاتی اعتبار سے مناسب نہ تھا۔ نہضت ملی اور مصدق کے حمایتی پارٹیوں کے لئے یہ بیان بڑا سود مند ہوا۔ انھوں نے مصدق کے جایز اور قانونی وزیر اعظم ہونے کے حق میں بڑا پرزور بیان شایع کیا۔ مصدق کے مخالفوں پر غدار اور رجانبدار ہونے کا الزام لگایا گیا۔ قوام السلطنۃ تو انگریزوں کا دوست مشہور تھا ہی سارا ملک غیظ و غضب سے آگ بگولہ ہوگیا۔ اللہ کاشانی اور نہضت ملی کے لیڈروں نے قوم سے درخواست کی کہ ۲۱ر جولائی کو قوام السلطنۃ کے تقرر کے خلاف عام ہڑتال کریں۔ نی نے قوام السلطنۃ کو چیلنج کیا کہ وہ ملک کی بیداری اور جوش وخروش کے دبانے میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا۔ "میں علانیہ ں کہ تمام مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ قوام السلطنۃ کے خلاف جہاد کرنے کے لئے کمر ہمت باندھیں اور سامراجی قوتوں پر ہمیشہ کے ت کردیں کہ اُن کی گزشتہ طاقت وعظمت کا زمانہ اب لوٹ کر آنے والا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ساری دوکانیں اور بازار بند کردئے گئے — صبح ۱۰ بجے سے لوگوں کا ہجوم بڑھنا شروع ہوا اور مصدق "پیروزاست" کے نعرے ہوئے خیابانِ بہارستان میں، جو ایرانی مجلس کی عمارت کے نزدیک ہے، جمع ہونے لگے۔ وہاں ان کی مڈبھیڑ فوجی دستوں سے ہوئی آدمی مارے گئے، بہت سے زخمی ہوئے اور بے شمار افراد گرفتار کئے گئے۔ مگر جوش وخروش سے بھری ہوئی قوم برطانیہ، امریکہ، قوام کے خلاف نعرے لگاتی ہوئی سڑکوں اور بازاروں کا گشت کرنے لگی۔ کئی جگہ تودہ (کمیونسٹوں) نوجوانوں نے شاہ کے مجسموں کو توڑ کر گرادیا یں شاہ کی تصویریں ملیں، پھاڑ چیر کر پھینکدیں۔ قزوین، ہمدان اور کرمانشاہ کے بہت سے لوگ سر سے کفن باندھے ہوئے آئے اور کی شاہراہوں پر مصدق کے حق میں مظاہرے کرنے لگے۔ جوش وخود گزشتگی کا یہ حال تھا کہ لوگ بھاری بھاری ٹینکوں کی توپوں پر چڑھکر کے رُخ فوجیوں اور سپاہیوں کی طرف موڑ دیتے۔ یہ عالم تھا کہ ہر قوم کا فدائی اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ آیت اللہ کاشانی نے اس جوش کی داد دیتے ہوئے اعلان کیا کہ "جو فوجی یا پولیس کا سپاہی قومی جدوجہد کے اس نازک موقع پر مصدق کے ہمدردوں پر گولی گا وہ دین و دُنیا دونوں جگہ روسیاہ اور ملعون بنکر رہے گا"۔

۲۱ر جولائی دو بجے کے وقت طہران کی مرکزی سڑکیں حشر کا میدان بنی ہوئی تھیں۔ چیخ، پکار، نعرہ وفریاد سے سارا شہر گونج رہا تھا۔ غرض قع پر ملک کی ساری سیاسی پارٹیوں نے متحد ہوکر قوام السلطنۃ اور شاہ کے فرمان کے خلاف مصدق کی حمایت میں بڑی سے بڑی دینے سے دریغ نہیں کیا۔ شاہ نے گھبراکر نہضت ملی کے لیڈروں سے مشورہ کیا اور اسی روز چار بجے "کل فوجی دستے اور وغیرہ واپس بلائے گئے۔ ہنگامہ وفساد کے شروع ہوتے ہی قوام السلطنۃ نے اپنا استعفا شاہ کو بھیجدیا تھا۔ اسی روز پانچ بجے اہنشاہی سے اُس کے قبول کئے جانے کا اعلان کیا گیا۔ جوش ونفرت سے بھرے ہوئے عوام نے قوام السلطنۃ کے مکان کا محاصرہ ہ تو خیریت ہوئی کہ وہ پہلے ہی کہیں روپوش ہوچکا تھا ورنہ اس کی جان کی خیر نہ تھی۔

۲۱ر جولائی کی فیروزمندی کو استعماری قوتوں کے خلاف عوام کی فیروزمندی سے تعبیر کیا گیا۔ امراء اور جاگیردار یہ مناظر دیکھ کر لرزہ ور رہے تھے — گویا خواب میں اپنی تباہی کا تماشا دیکھ رہے تھے اور ڈر رہے تھے کہ اگر یہ خواب حقیقت میں تبدیل ہوگیا تو پھر ان کا ہوگا۔ عام طور پر کہا جارہا تھا کہ یہ کامیابی تودہ جماعت کی سرگرمی اور قوت کی مرہون منت ہے جنھوں نے نہضت ملی والوں سے

نوٹ آیندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو

مل کر مصدق کو کامیاب بنایا۔ غرض مصدق پھر قوم کا سردار تھا۔ شاہ نے اُس کا وزیر جنگ ہونا بھی مان لیا ـــــ شاہ کا وقار اور رعب آہستہ آہستہ لوگوں کی نگاہوں میں کم ہونے لگا۔ اُس کے اور "دربار" کے خلاف اب زیادہ نعرے سننے میں آنے لگے۔ بلوہ کے دوران میں جو توڑ پھوڑ اور خونریزی ہوئی تھی اُس کا ذمہ دار بھی بادشاہ ہی کو ٹھہرا دیا گیا، کیونکہ فوج اُس کے کنٹرول میں تھی اور گولیاں اُسی کے حکم سے چلائی گئی تھیں ـــ یہاں امریکنوں کے متعلق بھی کچھ کہہ دینا نامناسب نہ ہوگا اس لئے کہ آنے والے واقعات سے اُن کی سیاست کا گہرا لگاؤ ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایران کے قومی کیرکٹر اور رجحانات پر اس سے ایک عجیب روشنی پڑتی ہے ـــ ایران میں امریکنوں پر بھی اس ہنگامہ کا بہت بُرا اثر پڑا۔ اُن کے خلاف بھی علانیہ خفگی کا اظہار ہونے لگا۔ برطانیہ تو خیر ایران کا دشمن نمبر اول تھا ہی، اب امریکہ کا شمار بھی اُن کے اس قومی ترین دشمن کے نزدیک ترین دستوں میں ہونے لگا۔ ایک بڑی وجہ اس اشتعال کی یہ بھی تھی کہ جو ملیٹری ٹینک اور اسلحہ عوام کے خلاف استعمال کئے گئے تھے وہ سب امریکہ ہی کے تھے جو جنگ دوم کے بعد ایران کی فوجی طاقت کو مضبوط بنانے کے لئے دئے گئے تھے ـــ مزید یہ کہ جس دن قوام السلطنہ مقرر ہوا تھا اُس دن تمام خارجی سیاسی نمایندوں میں سب سے پہلے امریکی سفیر ہنڈرسن ہی اُس سے ملا تھا اور اس تقرر پر مبارکباد پیش کی تھی اور اُس نے اس معاملہ پر "ہمدردی کے ساتھ" غور کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اس بات پر سخت برہمی کا اظہار کیا گیا۔ ممتاز قومی لیڈروں اور اخباروں نے امریکہ پر اعتراضات کی بوچھار شروع کر دی۔ معاندانہ مضامین لکھے گئے۔ کہا گیا کہ "ایران اس طرح کی خود غرضانہ امداد قرض کی ذلت کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ ہم غریب اور پریشان حال سہی، لیکن اتنے گرے ہوئے ہرگز نہیں کہ اپنی قومی عزت بیچ کر امریکن ڈالر کے غلام بن جائیں ـــــ ـ تو وہ اخبارات "بسوئے آیندہ" اور "صدائے مردم" کرنے اور بھی سخت حملے کئے۔

ایرانی عوام جس قدر انگریزوں سے مرعوب اور اُن کی سیاسی سازشوں اور فتنہ پردازیوں سے اندیشہ ناک تھے، اب ان میں اُسی قدر جرأت اور خود اعتمادی کے جذبات پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر مصدق کی ذات اب اُن کی نگاہ میں محض ایک سیاسی پیشوا اور قائد ملت ہی کی نہ تھی۔ اُس کا شمار فوق الفطرۃ زعماء اور وقت کے حیرت ناک انسانوں میں ہونے لگا تھا ـــ عام طور پر کہا جاتا تھا کہ مصدق خدا کی بھیجی ہوئی ایک پُراسرار شخصیت ہے جو ایران کی مظلوم اور ستمدیدہ قوم کی بدبختی، افلاس اور ذلت کی زندگی سے نجات دلانے کے لئے آئی ہے ـ قومی بے غرضی اور فداکاری میں وہ ایران کا گاندھی سمجھا جاتا تھا، سیاسی سوجھ بوجھ اور ژرف نگاہی میں اس ملک کا نہرو۔ الغرض اُس کی محبوبیت کا سورج نصف النہار پر تھا۔ وہ ملکی عزت و آبرو کا محافظ تھا اور قومی آرزوؤں اور تمناؤں کا مظہر۔

ٹرومن-چرچل کا مشترکہ پیغام

جہاں بینک کی ناکامیابی کے بعد امریکی سفیر مسٹر ہنڈرسن کی دوڑ دھوپ کی بدولت ایران اور برطانیہ کی حکومتوں کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ ہنڈرسن، ایرانی، برطانوی خطرناک کشیدگی کو دور کرنے کی ہر ممکن سعی کر رہا تھا۔ اُس کی ساری کوشش اس بات پر مرکوز تھی کہ طرفین میں گفت و شنید کا دروازہ بالکل بند نہ ہونے پائے۔

۲۷ اگست ۱۹۵۲ء کو مسٹر ہنڈرسن اور برطانوی نائب سفیر مسٹر جارج مڈلٹن (جو آجکل ہندوستان میں برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر ہے) نے پہلی بار ایک ساتھ ڈاکٹر مصدق سے ملاقات کی اور اس موقع پر امریکی پریسیڈنٹ مسٹر ٹرومین اور برطانوی وزیر اعظم مسٹر چرچل کا بھیجا ہوا ایک مشترکہ تحریری پیغام، جس پر دونوں لیڈروں کے دستخط ثبت تھے، ڈاکٹر مصدق کو دیا۔ اس پیغام کے ساتھ جس میں ایران کے لئے دوستی اور مودت کا اظہار کیا گیا تھا، مسٹر چرچل کی طرف سے تیل کے قضیہ کو حل کرنے کے لئے حسب ذیل تجویزیں بھی پیش کی گئی تھیں:-

---

(فٹ نوٹ صفحہ ۷)

لوگوں کا بیان ہے کہ بلوہ کے شروع ہوتے ہی قوام، مصدق کے گھر میں روپوش ہو گیا تھا اور مہینوں وہیں پناہ گیر رہا۔ بظاہر یہ افواہ یقین کرنے کے قابل نہیں۔ لیکن ایران میں ایسی باتوں کا وقوع پذیر ہونا تعجب کی بات نہیں۔ یہاں کے کم و بیش تمام امراء و حکام ایک دوسرے سے خاندانی رشتہ رکھتے ہیں۔ قوام دور کے رشتہ سے مصدق کا عزیز ہوتا ہے۔

ایرانی تیل کی صنعت کے قومی بنائے جانے کے سبب سے اینگلو ایرانین آئل کمپنی کو جو نقصانات اُٹھانا پڑے ہیں ان کا معاوضہ ادا
سوال بین الاقوامی عدالت کے سپرد کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں تیل کے قومی بنائے جانے سے قبل جو طرفین کی قانونی پوزیشن تھی
رفین کے کل دعووں اور جوابی دعووں کو نگاہ میں رکھا جائے گا۔

تیل کو ایران سے دُنیا کے بازار میں پہونچانے کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے اینگلو ایرانین کمپنی اور ایرانی حکومت کی طرف سے مناسب
ے مقرر کئے جائیں گے۔

اگر ایرانی حکومت نے مذکورۂ بالا دو شرطیں منظور کرلیں تو :-

اس کا امکان ہے کہ اینگلو ایرانین تیل کی کمپنی کے نمایندے آبادان میں جو تیل کا ذخیرہ موجود ہے اُس کے اُٹھانے کی کوشش کرینگے
قیمت کے متعلق سمجھوتہ ہوگیا اور اس کے ساتھ تیل کو جہاز پر بار کرنے کے قدرتی حالات (Physical Conditions) بھی
ہوئے تو جتنا تیل اُٹھایا جائے گا اُس کی قیمت ادا کردی جائے گی۔

خارجی ممالک سے ایران کو اشیاء بھیجے جانے نیز ایران میں اسٹرلنگ کے استعمال پر جو پابندیاں عاید ہیں برطانوی حکومت اُنھیں
ھیلا کردے گی۔

ایرانی بجٹ کی مشکلات میں ہاتھ بٹانے کے لئے امریکی حکومت فوری طور پر ایک کرور ڈالر کی رقم ایرانی حکومت کو دیگی۔

یزوں کی مخالفت اور رد

مصدق، ہنڈرسن اور ڈلٹن کے درمیان اِن تجویزوں کے متعلق کوئی چار گھنٹے بحث ہوتی
رہی، دونوں نے مصدق کو راضی کرنے کی پوری کوشش کی مگر اُس نے تجویزوں کے کل نکات
ت آمیز اور قومی مفاد کے خلاف سمجھ کر اُسی وقت رد کردیا ـــــ حقیقت یہ ہے کہ اس مشترکہ پیغام میں برطانیہ نے اپنے روایاتی اور
لسانی پیچ وخم سے کام لیکر ایسی شرطیں پیش کی تھیں جن کے مان لینے کے بعد ایران کو اپنے بنیادی دعووں سے ہمیشہ کے لئے دست
جانا پڑتا۔ مثلاً تجویز نمبر (۱) میں جس سطر کے نیچے خط کھینچ دیا گیا ہے اُس کے قبول کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ۱۹۳۳ء کے تیل کے معاہدہ
ایران ہمیشہ سے تحمیلی (Imposed) کہتا آرہا تھا، اب قانونی اور جایز تسلیم کرتا ہے، نیز یہ کہ یہ معاہدہ اپنی جگہ بدستور باقی
ایرانی حکومت کی طرف سے حقیقتاً رد نہیں کیا گیا ہے۔ تجویز نمبر (۳) کے جس سطر کے نیچے خط کھینچ دیا گیا ہے اُس کے معنی یہ ہوئے کہ آبادان
یگاہ (Refinery) کے چلانے کے لئے تیل کے انگریز ماہروں اور کارشناسوں کا تقرر ضروری ہوگا ـــ پھر یہ جو کہا گیا کہ
ب قیمت ادا کردی جائے گی"، تو اس "مناسب قیمت" کا تعین ضرور کرے گا ـــ یہ تجویز بھی کہ "معاوضہ ادا کرنے کا سوال جہانی عدالت
کردیا جائے گا" ایران کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتی تھی۔ ڈاکٹر مصدق نے قضیہ کے شروع ہی سے یہ پوزیشن اختیار کر رکھی تھی کہ تیل کا
یرانی اور برطانی "حکومتوں" کے بیچ میں نہیں بلکہ "ایرانی حکومت" اور ایک انگریزی "تجارتی تیل کی کمپنی" کے درمیان ہے۔ جہانی عدالت
ی نکتہ کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ تیل کا قضیہ سکوریٹی کونسل کے احاطۂ ذمہ داری سے باہر ہے۔

۳۰ اگست کو طہران ریڈیو سے براڈ کاسٹ کرتے ہوئے مصدق نے کہا: "میں ذاتی طور پر ان تجویزوں کے قبول کرنے کے حق میں نہیں ہوں
ی فیصلہ مجلس کے ہاتھ میں ہے جو ۱۰ ستمبر کو اس مشترکہ پیغام پر غور کرے گی۔ اس معاملہ میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ قضیہ کا جو حل اس پیغام میں پیش
ہے وہ نہ صرف یہ کہ غیر عادلانہ ہے بلکہ ساری اگلی تجویزوں سے زیادہ سخت گیر اور زیادہ ناقابلِ عمل بھی ہے۔ ان شرطوں کے عاید کرنے کا مقصد
ہوتا ہے کہ اب تک کی جدوجہد کے سارے نتائج کو برباد کردیا جائے۔ اپنی خود مختاری کے حقوق کی دفاع کے سلسلہ میں جو مشکلات اور مصائب
داشت کرنا پڑے ہیں ہمیں اُن کے نتیجہ سے بہرہ اندوز نہ ہونے دیا جائے، نیز یہ کہ جہانی عدالت میں ایران کو جو کامیابی نصیب ہوئی ہے وہ بھی
رے لئے بانجھ اور بیکار ہوکر رہ جائے!- پیغام کی تیسری شق تو اور بھی توہین آمیز ہے۔ اس میں انگلستان اس کا اعتراف کرتا ہے کہ اُس نے ایران
کی غیر قانونی پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ لیکن اگر ہم اُس کی پیش کردہ شرطوں کو مان لیں تو یہ پابندیاں "ڈھیلی" کی جاسکتی ہیں! آخر میں ان

تجویزوں کے ایک خاص پہلو کی طرف اشارہ کرنا بالکل ضروری سمجھتا ہوں۔ اس پیغام کے سیاق و سباق سے صاف نمایاں ہے کہ انگلستان ہنوز غلط فہمی میں گرفتار ہے کہ اُس کی لگائی ہوئی پابندیوں کے فشار سے حکومت و ملتِ ایران مجبوری اور ضیق کے ایسے سکرات میں مبتلا ہے کہ اب وہ ان کی شرطوں کے آگے سرِ تسلیم خم کردے گی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سارے مالی و اقتصادی مشکلات کے باوجود ملتِ ایران کسی ایسی نامنصفانہ شرط ماننے کے لئے آمادہ نہیں جو اس کے ملکی مفاد اور قومی وقار کا گلا گھونٹنے والی ہو۔"

یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ ۱۰ ستمبر کو مجلس نے ایک خصوصی جلسہ میں ان تجویزوں پر غور کیا اور انھیں "قطعاً ناقابلِ قبول" قرار دیا۔ رائے عامہ کے ہر طبقہ نے ان تجویزوں کی مخالفت کی۔ اخباروں نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا کہ "اس سے زیادہ توہین آمیز اور تحقیری تجویز تصور نہیں کیا جاسکتا" انگریزوں کے ساتھ اس سلسلہ میں امریکنوں کی بھی خوب خبر لی گئی۔ ٹرومن کو چرچل کا "سیاسی مصاحب" کہا گیا۔ بعض لیڈروں اور تودہ جماعت کے رہبروں نے امریکہ کے ایک کروڑ ڈالر کی رقم کو خیرات سے عبارت کیا اور کہا کہ "آخر ان مغربی سیاست دانوں نے ایران اور ایرانیوں کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ کیا ہم ان کی روٹیوں کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرتے ہیں۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ"

ایرانی حکومت کی جوابی تجویزیں

۲۴ ستمبر کو ڈاکٹر مصدق نے اپنی جوابی تجویزیں برطانوی وزیر اعظم مسٹر چرچل کو بھیجیں۔ اُس کی ایک کاپی امریکی پریسیڈنٹ مسٹر ٹرومن کو بھی روانہ کی گئی۔

جوابی تجویزیں یہ تھیں:-

(۱) ایرانی حکومت معاوضہ[1] کی رقم ادا کرنے کا وعدہ کرتی ہے۔ لیکن اس رقم کا تعین ایران کی عاید کردہ شرطوں کی بنا پر ہوگا۔ ان حدود میں رہ کر جہاں عدالت جو رقم بھی معین کردے گی ایران اُس رقم کو تیل دیکر یا زرِ نقد کی صورت میں بالاقساط ادا کردے گا۔

(۲) حسب ذیل شرح کے مطابق ایران اُنچاس ملین پاؤنڈ کی مجموعی رقم برطانیہ سے پانے کا حقدار ہے۔ یہ رقم جلد از جلد ایرانی حکومت کے حوالہ کردی جائے

(الف) گزشتہ چند سالوں سے ایران کی خاصی بڑی رقمیں سابق انگریزی کمپنی کے ذمہ باقی چلی آتی ہیں۔ یہ رقمیں اور ان کے دیر سے ادا کرنے کا ہرجانہ دیا جائے

(ب) آٹھ ملین پاؤنڈ اسٹرلنگ (sterling) کی وہ رقم جو بینک آف انگلینڈ میں ایران کے نام جمع ہے، وہ ادا کی جائے۔

(ج) ایرانی تیل کی وہ زاید مقدار جو اتحادی فوجوں نے جنگِ دوم کے دوران میں استعمال کی ہے۔ اُس کی قیمت بھی دیجائے۔

(د) ایران کو اقتصادی مشکلات میں جکڑ رکھنے کے لئے برطانوی حکومت دھمکیوں اور طرح طرح کی سازشوں سے دُنیا کے بازار میں ایرانی تیل کی آزادانہ فروخت کو روکتی رہی ہے۔ اس طرح کے ناجائز محاصرہ سے ایران کو جو مالی نقصانات پہونچتے رہے ہیں اُن کا تاوان بھی ادا کیا جائے۔

برطانیہ کا جواب

برطانوی وزیر خارجہ مسٹر انتھنی ایڈن نے ان جوابی تجویزوں کے جواب میں ۵ اکتوبر کو ایک مختصر سا وضاحتی نوٹ ایرانی حکومت کو بھیجا۔ امریکی وزیر خارجہ مسٹر اچیسن نے بھی اُسی روز مگر علٰحدہ ایک نوٹ بھیجا جس کا لب و لہجہ زیادہ دوستانہ و نرم تھا۔ ان دونوں نوٹوں میں ایک بار پھر پہلے مشترکہ پیغام کے دوستانہ جذبات کا اعادہ کیا گیا اور اس بار بہت واضح طور پر حسب ذیل نکات پر زور دیا گیا تھا:

(۱) عُلیا حضرت ملکۂ معظمہ کی حکومت ایرانی تیل کی صنعت کا قومی بنایا جانا تسلیم کرتی ہے۔

(۲) عُلیا حضرت کی حکومت ۱۹۳۳ء کے ایرانی - برطانوی تیل کے معاہدہ کے احیاء و تجدید کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔

(۳) عُلیا حضرت کی حکومت کو اس بات پر بھی کوئی اصرار نہیں کہ تیل کے کارخانہ میں خارجی کارکن رکھے جائیں۔

(۴) نہ وہ پہلے کی طرح تیل کی خریداری کی واحد اجارہ دار بنی رہنے کا کوئی خیال رکھتی ہے۔

---

[1] ایرانی تیل کے قضیہ کے حل میں ایک بڑی رکاوٹ معاوضہ کا مسئلہ ہے۔ سابق انگریزی تیل کی کمپنی کے وہ سارے املاک جو ایرانی تیل کی صنعت کے قومی بنائے جانے کے بعد اب ایران کی ملکیت بن گئے ہیں برطانی حکومت اب ان سب کا مجموعی معاوضہ طلب کرتی ہے۔ انگریزوں کی طرف سے اس معاوضہ کی رقم کچھ اور بتلائی جاتی ہے۔ ایران کی طرف سے کچھ اور انگریزوں کی بتلائی ہوئی رقم کے اعداد اتنے ہیں کہ ایران شاید اپنے کو برباد کرنے کے بعد بھی وہ رقم ادا نہیں کرسکتا۔

ں کے انکار کا تجزیہ

انگلستان کی ڈپلومیٹک تاریخ میں بین الملی معاملوں پر مذکورۂ بالا نوٹ سے زیادہ صاف اور صریح اعلان کی شاید کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی۔ اس نوٹ میں برطانیہ نے تقریباً وہ سارے مطالبات تسلیم کر لئے جو تیل کے قضیہ ں ایران کے لئے بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتے تھے، خود کاشانی نے اس بیان کے متعلق یہ کہا کہ آخر انگریزوں کو ہماری قومی جنگ کے آگے ہتھیار ے" قومی جدوجہد کی مدت ہمیشہ طویل ہوا کرتی ہے۔ خاص طور پر اگر واسطہ کسی طاقتور اور عیار حریف سے ہو۔ لیکن ایرانی تیل کی صنعت کے مصدق نے برطانیہ کے خلاف "علم استقلال" بلند کر کے بہت ہی قلیل عرصہ میں جیسی وقیع کامیابیاں حاصل کیں اور اپنے مطالبات کے آگے گلستان کو جھکنے پر مجبور کر دیا وہ اُس کے دور حکومت کا ایسا شاندار کارنامہ ہے جسے ایرانی تاریخ کا کوئی دیانتدار مورخ کبھی فراموش نہیں کر سکتا ر مصدق، واقعاً انگریزوں سے صلح کا خواہشمند ہوتا اور تیل کی صنعت کے علاوہ کوئی اور مقصود اس کے پیش نظر ہوتا تو وہ اس نوٹ کا یر دونوں ملکوں کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے بآسانی ایک خوشگوار فضا پیدا کر سکتا تھا — لیکن بعد کو جو واقعات پیش آئے اور اُس کی ست نے جو رخ اختیار کیا ان کو زیر نظر رکھتے ہوئے بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی مساعی و مجاہدت کا اصلی ہدف تیل کا مسئلہ نہ تھا، یں کہیں اور لگی ہوئی تھیں — وہ ایران کی شاہی حکومت کے مصرف، جنگی مرصع اور کہن سال ادارہ کو ختم کر کے یا اُس کے خاتمہ لکر ملک کو جمہوری بنانا چاہتا تھا یا جمہوریت کا ڈھانچہ تیار کرنا چاہتا تھا۔ یہ مفسرانہ استنباط نہیں۔ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے اور مصدق کی سیاسیات کا بغور مطالعہ کرے گا وہ اسی نتیجہ تک پہونچے گا۔ وہ انگریزوں سے صلح کیونکر کرتا، .....

..... جب کہ یہ اُس کا مستحکم عقیدہ تھا کہ اگر انگریز ایران میں موجود رہے تو یہ اپنی بیسیوں زیر زمینی دور ساز شوں سے کام لیکر ایرانی شاہنشاہیت کو بقید حیات رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے ..... اور جب تک "دربار" اپنی موجودہ ں شکل میں باقی رہے گا ملکی سیاست "بیرونی" مداخلت سے کبھی آزاد نہیں ہو سکتی اور جب تک یہ نہیں ہوتا ایران کی اقتصادی ست ہونا محالات سے ہے۔

لاصہ یہ کہ اگر مصدق آسودہ اور مطمئن ہونا چاہتا تو برطانوی جواب میں بطور مجموعی وہ سب کچھ موجود تھا جو اُسے آسودہ اور مائل بہ ر سکتا تھا۔ البتہ اُنچاس ملین پونڈ کے متعلق اس نوٹ میں کامل خاموشی اختیار کی گئی تھی۔ اُس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انگریزوں کو اسکا سا کہ یہ رقم ہاتھ میں آنے کے بعد مصدق ان کا حامی و ہمدرد بن جائے گا یا کم از کم اپنی گرفت ڈھیلی کر دے گا۔ اور وہ ایسا سمجھنے میں حق ں تھے۔ قضیہ کے شروع ہی سے مصدق نے جو رویہ اختیار کر رکھا تھا اُسے یقیناً صلح جو یانہ نہیں کہا جا سکتا — لیکن جہاں تک مصدق ہے وہ اس رقم کے مطالبہ میں ذرا بھی رو و رعایت سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ یہ مطالبہ اُس کے ہاتھ میں دو دھاری تلوار کی حیثیت رکھتا تھا سے مل گئی تو اس سے بڑھکر اُس کی اور کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی، ملکی اقتصادیات کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے کے لئے اُسے روپیہ کی ی اور اشد ضرورت تھی — اور اگر نہیں ملی تو یقیناً انگریز ایران کا دشمن ہے اور ایرانیوں کی فلاح و ترقی کا خواہاں نہیں — اور اگر انگریز پھر انھیں گھر میں جگہ کیوں دی جائے۔ ایسا کرنا گویا سانپ کو دودھ پلانا ہے۔

انگریزی روابط کے انقطاع کی افواہ

اس تمام عرصہ میں دونوں ممالک کے تعلقات کی ڈور تنتی جا رہی تھی۔ طوفانی آثار فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ دونوں حکومتوں کی گفتگو اُنچاس ملین پاؤنڈ متعلق جس ڈھنگ سے جاری تھی اُس سے صاف ظاہر تھا کہ معاملہ سنبھلنے والا نہیں۔ اُدھر چرچل تھا، اِدھر مصدق۔ اور یہ ضد، سرکشی اور خودرائی کے لئے دُنیا کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ایرانی تیل کی لڑائی کے گرم ہوتے ہی مسٹر ایٹلی کی لیبر حکومت لی کنزرویٹو پارٹی سے شکست کھا چکی تھی۔ جب تک لیبر پارٹی کی حکومت رہی۔ یہ امید کی جاتی تھی کہ ایٹلی اپنی میانہ روی اور بعد از کی مزاج شناسی کی وجہ سے شاید اس خطرناک قضیہ کا کوئی معقول حل پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن چرچل کی طاقت میں آنے رف ناامیدی کا سناٹا چھا گیا۔ انگلستان کی تغیر حکومت کا اثر نفسیاتی اعتبار سے ایران پر کچھ عجیب سا پڑا۔ اس اندیشہ کی بنا پر کہ

چرچل، ایران کو زبردستی نیچا دکھانے کی کوشش کرے گا، اس ملک کے عوام میں حیرتناک تابِ مقاومت پیدا ہوگئی۔ سوال قومی آن کا آپڑا تھا۔ کچھ ایسا جذبہ پیدا ہوگیا تھا کہ ملک کی کمر توڑی جا سکتی تھی، جھکائی نہیں جا سکتی تھی۔ ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ:" انگلستان میخواہند کہ ایران را از پا در می آرند" (یعنی ہمارے پاؤں اکھاڑ دیں)۔ ولی ما مصمم ہستیم کہ تسلیم نخواہیم شد (ہم ہرگز نہیں جھکیں گے) مصدق اس صورت حال سے قدرتاً غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ ٹرومن، چرچل، تجویز کے رد کردئے جانے کے بعد ہی سے ہر طرف یہ سنا جا رہا تھا کہ ایران و برطانیہ کے سیاسی روابط اب زیادہ دیر تک قایم نہیں رہ سکتے۔ چرچل اُنچاس ملین پاؤنڈ دینے والا نہیں۔ مصدق اس مطالبہ سے باز آنے والا نہیں۔ یہ رسہ کشی صرف دو ہی نتیجہ پیدا کر سکتی ہے۔ یا تو دو ملکوں میں لڑائی چھڑ جائے گی یا انگریزوں کو ایران چھوڑنا پڑے گا شروع ہی سے انگریز جس طرح دیتے چلے آرہے تھے اُس کو دیکھتے ہوئے دوسری صورت زیادہ قرین قیاس سمجھی جا رہی تھی۔ ایک بڑا سوال تھا کیا انگریز اُنچاس ملین پاؤنڈ کے مقابلہ میں ایران سے نکالے جانے کی اہانت کو برداشت کرلیں گے؟ - اس سے تو مشرقی وسطیٰ میں انکی سیاسی اور تجارتی اقتدار کو سخت دھکا لگے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کی صدیوں کی جمی ہوئی دھاک کے اس طرح اُٹھ جانے کے بعد اس علاقہ کے ایسے ممالک جو گاہ گاہ اُن کے دیرینہ سال سیاسی تسلط اور تجارتی لوٹ کھسوٹ کے خلاف تنفر اور برہمی کا اظہار کرتے رہتے ہیں وہ بھی ایران کے راستہ پر چلنا شروع کردیں۔ علاوہ بریں روس اور امریکہ کی مزید سیاسی چالوں کے لئے میدان بالکل صاف ہوجائے خصوصاً امریکہ جو تمام مشرقِ میانہ سے انگریزی نفوذ و رسوخ کو دور کرکے خود حاوی ہوجانا چاہتا ہے، اس نادر موقع سے زیادہ سے زیادہ فایدہ اُٹھانے کی کوشش کرے گا (جو حقیقتاً وہ کر رہا ہے) غرض طہران کے ہوٹل ہوں، یا قہوہ خانے، سیاسی محفلیں ہوں یا اخباری حلقے ہر جگہ اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ مصدق نے "برطانیہ عظمیٰ" کی اہمیت اور دبدبہ کو اپنی قوم کی نگاہ میں اس قدر حقیر کرکے رکھدیا تھا کہ معمولی سے معمولی ایرانی بھی اب انگریزوں کے ایران کو چھوڑ کر چلے جانے کے خیال کو ممکن سمجھنے لگا تھا۔ اُسکے نزدیک اس چیز کا وقوع پذیر ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں رہی تھی۔ مصدق کے طاقت میں آنے سے پہلے اس ملک میں انگریزوں کا وہ جاہ و جلال تھا کہ ایرانی ذہن اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

ہندوستانی سفیر کی وساطت کا چرچا

اسی دوران میں طہران کے اخباروں میں یہ خبر شایع ہونے لگی کہ برطانوی حکومت نے ہندوستانی حکومت سے یہ درخواست کی ہے کہ وہ اپنے سفیر ڈاکٹر تاراچند کے ذریعہ سے طرفین کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرے۔ چونکہ ہند و ایران کے باہمی تعلقات بہت خوشگوار ہیں اور پنڈت نہرو اپنی کئی تقریروں میں تیل کے معاملہ میں ایرانی قومی مطالبات کی حمایت کرتے رہے ہیں، اس لئے ممکن ہے کہ ڈاکٹر مصدق ہندوستان کا دوستانہ مشورہ سننے پر راضی ہوجائے۔ اس کے علاوہ طہران کے سیاسی اور سرکاری حلقوں میں یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ وزیر اعظم مصدق ہندوستانی سفیر ڈاکٹر تاراچند کے اخلاق اور شرافت کا بڑا مداح ہے۔ اس اعتقاد کو مزید تقویت دینے والی بات یہ تھی کہ مصدق نے اپنے ڈھائی سالہ دورِ حکومت میں ایک بار بھی کسی خارجی سیاسی نمایندے کی کوئی مخصوص دعوت اپنے گھر پر نہیں کی۔ کم از کم ایسی کوئی خبر کسی سے سننے یا کسی اخبار میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ لیکن اُس نے خاص طور پر ایک بار ڈاکٹر تاراچند اور اُن کی فیملی کو عصرانہ پر بلایا۔ اخباری رپورٹوں کے بقول" اس دعوت میں گھریلو بے تکلفانہ فضا پیدا کرنے کے لئے مصدق اپنی ڈھائی سال کی پوتی کو گود میں لیکر بیٹھا اور گھنٹوں گھل مل کر باتیں کرتا رہا ــــ" طہران کے تقریباً تمام ممتاز اخباروں نے اس "غیر معمولی عصرانہ" کی خبر کو معہ تصویروں کے سرورق پر چھاپا ــــ مزید یہ کہ شاید اُنچاس ملین پاؤنڈ کے اٹل مطالبہ کو نرم اور قابلِ قبول بنانے کے سلسلہ میں ہندوستانی سفیر کا بار بار مصدق سے ملاقات کرنا خود اس بات کا کھلا ہوا ثبوت سمجھا جا رہا تھا کہ ہندوستان تیل کے جھگڑے کو رفع دفع کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُنھیں دنوں برطانوی نائب سفیر جارج مڈلٹن نے بھی کئی بار ڈاکٹر تاراچند سے ملاقات کی تھی۔ طہران کے بعض اہم حلقوں میں امید کی جا رہی تھی کہ ہندوستانی سفیر وزیر اعظم مصدق کو راہ پر لگالانے میں کامیاب ہوجائے گا اور ایران و انگلستان کے سیاسی روابط کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔ اُنھیں دنوں سر مرزا محمد اسمٰعیل سابق وزیر اعظم ریاست میسور بھی "سیاحت" کی غرض سے ایران آئے۔ وہ مصدق۔ کاشانی۔ وزیر دربار حسین علاء

رسن، تاراچند اور غضنفر علی خاں وغیرہ سے ملے۔ اخباروں نے قیاس آرائیاں شروع کر دیں کہ سر مرزا جیسی معروف شخصیت کا ایسے نازک موقع پر ایران
ور یکے بعد دیگرے ممتاز مقامی سیاسی افراد سے ان کا ملاقات کرنا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ ہندوستان تیل کے مسئلہ کو حل کرنے میں دلچسپی لے رہا ہے۔

طانیہ کے نام مصدق کا آخری نوٹ

ڈاکٹر مصدق نے انگلستان اور امریکہ کے وزراء خارجہ کی چٹھیوں مورخہ ۵ اکتوبر ۵۲ء کا جواب بھیجنے میں تاخیر سے کام نہیں لیا۔ برطانیہ کے نام ڈاکٹر مصدق کی یہ آخری چٹھی تھی جو
ستوبر کو برطانوی سفارت کو بھیجی گئی۔ اپنے اس نوٹ میں مصدق نے اُنچاس ملین پاؤنڈ کے مطالبہ کے متعلق برطانیہ اور امریکہ کی کامل خاموشی کا شکوہ
ور حسب ذیل دو تجویزیں پیش کیں :-

(۱) تیل کے قضیہ کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے سابق انگلو۔ ایرانین آئل کمپنی، کامل اختیارات سے مسلح ایک وفد ایران بھیجے۔ اس وفد کو آج کی تاریخ سے
ہ بھر کے اندر طہران پہونچ جانا چاہئے۔ یہ ڈیلیگیشن تیل کے قومی بنائے جانے کے قانون کے حدود میں رہ کر ایرانی حکومت سے گفتگو کرے گی۔ گفتگو کی مدت تین ہفتے
ہ۔ (۲) ایرانی حکومت نے جو اُنچاس ملین پاؤنڈ کی رقم کا مطالبہ کیا ہے اس میں سے برطانوی حکومت بیس ملین پاؤنڈ جسے ڈالر میں تبدیل کیا جا سکے بطور
دی ادا کر دے۔ بقیہ اُنتیس ملین پونڈ ایرانی حکومت کے حساب میں جمع کر دی جائے یہ رقم مذکورۂ بالا گفتگو کے تمام ہو جانے کے بعد ایران کے حوالہ کر دی جائے۔

ان تجویزوں میں ڈیلیگیشن کے ورود کے لئے ہفتہ بھر کی قید۔ ڈیلیگیشن کے آنے سے قبل بیس ملین پاؤنڈ کی ادائی، گفتگو کے لئے تین ہفتہ کی میعاد اور
دت کے تمام ہونے پر ایرانی حکومت کو بقیہ اُنتیس ملین پاؤنڈ کے دئے جانے کی شرط ۔۔۔۔ یہ باتیں اور ان کے ساتھ ان تجویزوں کا لہجہ کچھ ایسا گرم اور
وستانہ تھا کہ برطانوی حکومت کے لئے ان کا قبول کرنا گویا ناممکن سی بات تھی۔ خود ایرانیوں کا خیال یہ تھا کہ ایسی کڑی شرطیں اس لئے لگائی گئی ہیں کہ انگریزوں
ان چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے۔ امریکی سفیر مسٹر ہنڈرسن، ہندوستانی سفیر ڈاکٹر تاراچند اور برطانوی نائب سفیر مسٹر مڈلٹن نے ان شرطوں کو معتدل اور نرم
نے کی کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی مگر مصدق ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اُس کی بس ایک رٹ تھی "من پول میخواہم پول"۔ ڈاکٹر مصدق کے قریب بیٹھنے والوں
ں ہے کہ ان تجویزوں کے سلسلہ میں ڈاکٹر تاراچند، مصدق سے یہ اصرار کر رہے تھے کہ وہ ایک بار پھر اپنی شرطوں پر نظر ثانی کریں لیکن مصدق نے ایک بے پروا
ہقہہ لگا کر اُن کو جواب دیا:- "آقائے سفیر کبیر شما نمی دانید کہ ایں انگلسہا چہ قدر موذی ہستند۔ ایامی فہمی موذی چیست؟"۔ ہندوستانی سفیر نے کہا:-
سانپ کو ہندوستان میں بھی موذی ہی کہتے ہیں"۔ "بس۔ بہ جان شما۔ باور کنید کہ ایں انگلسہا موذی ہستند۔ برائے آنہا اینقدر پول چیزی مہم نیست۔
را (واقعی طور پر) میں می داشتند آسانی میدادند۔ ولی اصلاً نمی خواہند۔ ہنوز دنبال ایں فکر ہستند کہ با فشار اقتصادی ایران را از پا در میآرند۔ نہ نہ بسر شما بزرگ
بیست میلیون لیرہ (پاؤنڈ) چیزی نیست"۔ ڈاکٹر تاراچند نے کہا۔ "مگر آپ کا تو اصرار یہ ہے کہ یہ بیس پاؤنڈ ملین کی رقم کو ڈالر میں قابل تبدیل ہونا چاہئے
سلسلہ میں بڑی دشواری یہ ہے کہ برطانیہ کے لئے یکبارگی اس قدر ڈالر کا فراہم کرنا ممکن نہیں۔ دنیا کے تمام نرم سکہ (Soft Currency) والے
کی طرح انگلستان بھی ڈالر کی کمی کے مشکلات سے دوچار ہے"۔ مصدق نے پہلو بدل کر کہا:- "بسر شما ایں ہمہ دروغ است۔ دروغ گندہ (بھاری
ط)۔ انگلسہا کہ اینقدر سنگ دوستی امریکا یہا را بسینہ خود میزنند (یعنی امریکنوں کی دوستی کا اتنا دم بھرتے ہیں) اگر حقیقتاً از حیث ڈالر در مضیقہ ہستند، چرا
یا دلار (ڈالر) نمیگیرند۔ من بشما راست میگویم۔ امریکا یہا بے نیستند۔ می دانید چوں در صفحہ سیاست تازہ وارد ہستند ازیں جہت کمی (زرا) سادہ ہستند۔
دہ من اینست کہ امریکا یہا حاضر ہستند کہ ایران را کمک (مدد) کنند مگر ایں پدر سوختہا (یعنی انگریز) نمی گذارند۔ جلوئی امریکا یہا را انگلسہا گرفتہ اند (انگریزوں
مریکنوں کی راہ روک رکھی ہے)۔ والا انگلسہا حقیقتاً در مضیقہ دلار نیستند ۔۔۔ مملکت شما کہ از دست انہا اینقدر زجر و مصیبت دیدہ است، آیا
نگلسہا را نمی شناسید"۔

جن لوگوں کو مصدق سے دو بدو باتیں کرنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ امریکنوں کے متعلق مصدق کا خیال کتنا اچھا تھا۔ وہ امریکنوں کو سیاسی مکر و زور
اور عیاری سے بڑی حد تک مبرا اور پاک سمجھتا تھا۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ ایشیا میں امریکی سیاست کی بدنامی کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی رہبری انگریزوں کے
ہ میں ہے۔

ایرانی۔ انگریزی ڈپلومیٹک روابط کا انقطاع

برطانوی حکومت نے ۱۴ر اکتوبر کو مصدق کے آخری نوٹ کا آخری جواب بھیجا جیسا کہ ہر شخص سمجھ رہا تھا، انگلستان نے صاف لفظوں میں ایرانی مطالبات کو "نامعقول اور ناقابل قبول" بتلایا۔ جواب میں کہا گیا کہ "علیا حضرت کی حکومت ایران کا یہ دعویٰ ہرگز قبول نہیں کر سکتی کہ دنیا کے بازار میں تیل کی فروخت نہ ہونے کی وجہ سے ایران، اینگلو ایرانین آیل کمپنی سے خسارہ طلب کرنے کا حق رکھتی ہے۔ دوم یہ کہ ایران اسی وقت انچاس ملین پاؤنڈ کا منافع پانے کا مستحق ہو سکتا تھا، جب ۱۹۳۳ء کا معاہدہ رد نہ ہوا ہوتا۔ اب جبکہ ایران یکطرفہ طور پر اس معاہدہ کو لغو قرار دے چکا ہے اس طلب کردہ رقم کے پانے کا ہرگز حقدار نہیں ہو سکتا۔ برطانیہ کے اس صریح جواب پر سارے ملک میں گویا آگ سی لگ گئی۔ کیا پریس اور کیا پبلک ہر طرف انگریزوں کے خلاف نفرت و عداوت کا اظہار پہلے سے زیادہ جوش و جنون کے ساتھ کیا جانے لگا۔ انھیں برملا خائن، ظالم اور فسقی کہکر پکارا جا رہا تھا۔ مصدق نے ۱۶ر اکتوبر کو اپنے تاریخی براڈ کاسٹ میں یہ اعلان کیا کہ "برطانیہ ہمارے جایز مطالبہ کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ وہ اس معاملہ کو تعویق میں ڈال کر ناجائز فایدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ میں صاف صاف کہتا ہوں کہ اگر انگلستان ہمارے ملک میں رہنا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ اپنی پرانی ذہنیت کا سانچہ بدل کر اپنے کو موجودہ حالات کے مطابق بنائے۔ ہماری اس قومی جنگ کے آغاز ہی سے انگریز ہمیں شکست دینے کے لئے طرح طرح کی سازشوں اور عیاریوں سے کام لیتے رہے ہیں ایران اپنے ملی مفاد کے خلاف برطانیہ کو اپنی مکروہ سازشیں اور قابل نفرت ریشہ دوانیوں کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہم مجبور ہیں کہ انگلستان سے اپنا سیاسی رشتہ توڑ لیں"۔

خلاصہ یہ کہ انگریزوں کی سفارت ۲۳ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ایران کی سرزمین سے ختم کر دی گئی۔

ایک کم سو سال سے برطانوی سفارت ایران میں کام کر رہی تھی اور اس کی جڑیں بڑی مضبوطی کے ساتھ "دور دور تک" پھیلی ہوئی تھیں ایران میں برطانیہ کے اس سیاسی ادارے کو عام سفارتخانوں پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کی حیثیت وہی تھی جو "غلام ہندوستان" میں "وائسریگل ہاؤس" کی۔ اس لئے کوئی تصور نہیں کر سکتا کہ دنیا کی اتنی بڑی حکومت کا سیاسی محکمہ "حافظ و خیام" کی سرزمین سے اتنی آسانی کے ساتھ خارج کر دیا جا سکتا ہے۔ خود مصدق نے ایک گفتگو کے دوران میں اس معاملہ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے یہ کہا تھا: "ما در این خصوصی خیلی نگران بودیم۔ اما بالآخرہ معلوم شد کہ کار مشکل نبود"۔ یعنی ہمیں خود اس سلسلہ میں بڑی گھبراہٹ اور پریشانی تھی۔ مگر آخر میں معلوم ہوا کہ یہ کوئی مشکل کام نہ تھا

دارالامراء کا خاتمہ

انگریزوں کی طرف سے اطمینان کا سانس لیکر مصدق نے اپنی توجہ ایرانی پارلیمان کے دارالامراء کی طرف مبذول کی۔ دارالامراء کو ایران میں سنٹ کہا جاتا ہے[1]۔ ڈاکٹر مصدق کی قیادت میں جب سے تیل کا قضیہ انگریزوں کے خلاف ایک اہم قومی مسئلہ بنکر رہ گیا تھا، سنٹ پر یہ اعتراض کیا جا رہا تھا کہ یہ ادارہ قومی آرزوؤں کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ جب سے سنٹ نے مصدق کے وزیر اعظم منتخب ہونے کی مخالفت کی تھی۔ شبہات اور اختلافات اور بھی زیادہ ہو گئے تھے اور کہا جاتا تھا کہ سنٹ انگریزوں کی ہمدرد اور "دربار" کے غیر قومی مقاصد کی حمایتی ہے۔ اس الزام کو ثابت کرنے کے لئے دو مثالیں زور و شور سے پیش کی جاتی تھیں:۔ (۱) سابق وزیر اعظم علی رزم آرا کے قاتل "مجاہد قوم" خلیل طہماسپی کی فوری رہائی کا بل اگرچہ مجلس نے کامل اتفاق رائے سے پاس کر دیا ہے مگر سنٹ نے اس کو معرض التواء میں ڈال رکھا ہے (۲) اسی طرح "خائن ملت" قوام السلطنہ کی ملکیتوں کی ضبطی کا بل جو اگرچہ مجلس سے تصویب ہو چکا ہے مگر سنٹ اسے بھی پاس کرنے میں حیلہ و حوالہ سے کام لے رہی ہے۔ یہ بھی عام طور پر کہا جا رہا تھا کہ بعض خاین اور غدار "سینٹر" پارلیمانی تحفظ کی پناہ لے کر اپنی خفیہ سازشوں سے حکومت کا تختہ الٹ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مصدق عام طور پر سنٹ کو "انگریزوں کی لائی ہوئی لعنت" اور قومی مفاد سے زیادہ "خارجی" مفاد کا محافظ کہا کرتا تھا[2]۔ سنٹ کے خلاف مصدق کے دو بڑے شدید اعتراضات یہ ہیں:۔ (۱) "ایک ایسے ملک میں جہاں عوام کی بڑی اکثریت کو پیٹ بھر کر

---

[1] ایران کی دستوری تاریخ کا یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ یہاں کی سنٹ یا دارالامراء کا ادارہ ۱۹۴۹ء میں موجودہ شاہ کے انگلستان سے واپس آنے کے بعد انگریزوں کی ایما اور اسوقت کے وزیر دربار ہجیر کی مساعی سے وجود میں آیا۔ ہجیر انگریزوں کا ہمکار ہونے کے "جرم" میں حزب فدائیان اسلام کے ایک عضو امامی نامی کے ہاتھوں ۱۹۴۹ء میں قتل کر ڈالا گیا۔ بہت سے انقلاب پسند ایرانیوں کا عقیدہ ہے کہ ملک کی ساری دولت کا کنٹرول دراصل برگزیدہ امراء اور زمینداروں کے اس قانونی انجمن کے ہاتھوں میں ہے

سا نصیب نہیں ہوتا، نہ برف باری کے موقعوں پر جاڑے کے موسم میں تن ڈھانپنے کو کپڑا میسر آتا ہے ایسے ملک کے پارلیمان کو دو ایوان (ہاؤس) کی کیا ضرورت ہے۔ سنٹ کے ممبروں کی تنخواہ اور اُس کے ادارہ و انتظام پر جو بھاری رقمیں خرچ ہوتی ہیں اُنھیں ملک کی اقتصادی حالت کے سنوارنے میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ (۲) اگر سنٹ کا وجود ضروری ہے تو اس کے مجموعی نمایندوں (۶۰) میں سے شاہ کو نصف ممبروں کے نامزد کرنے کا حق نہیں ہونا چاہئے۔ کم از کم ان تیس "ٹوڈیوں" کی جماعت "درباری" مقاصد کی سب سے بڑی پشتیبان ہے ــــ"

کسی جگہ لکھا جا چکا ہے کہ سنٹ کی منظوری کے بغیر مجلس کا کوئی بل قانون نہیں بن سکتا۔ اگر کسی موضوع پر ان دونوں مجلسوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے ..... تو پھر دونوں مجلسوں کے نمایندوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جاتی ہے، جس کا فیصلہ دونوں مجلسوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر مجلس کے نزدیک یہ فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہوتا تو اُس حال میں شاہ کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ ایک یا ہر دو مجلس کو ختم کر دے۔

چونکہ شاہ اور مصدق کے اختلافات کی خلیج وسیع تر ہوتی جا رہی تھی اس لئے مصدق کو یہ اندیشہ تھا کہ سنٹ جس میں نصف سینیٹروں کی تعداد شاہ کے "معتمدین خاص" کی ہے، یقیناً شاہ کی پاسداری کرے گی اور شاہ کی کوشش بھی قدرتاً یہی ہوگی کہ وہ مجلس کے مقابلہ میں سنٹ کو باقی رکھے۔ ... اس طرح سارے ملکی معاملہ کی کنجی ہمیشہ کی طرح سنٹ کے توسط سے شاہ کے ہاتھ میں رہے گی ــــ یہ تھی وہ صورتِ حال جسے مصدق اپنے "مقاصد" کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔

انگریزوں کو ایران سے نکالنے کے کوئی تین چار روز کے بعد نہضت ملی کے ارکان سنٹ کے "مخالفانہ رویوں" کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے لگے۔ اس دوران میں شاہ اس قدر بے دست و پا ہو چکا تھا کہ اُس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ مصدق اور مجلس کے زور کے آگے سر جھکا دے۔ چنانچہ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو شاہ نے سنٹ کے خاتمہ کا فرمان جاری کر دیا۔ عوام نے مصدق کی اس کامیابی پر فلک شگاف نعرے لگائے۔ تودہ پارٹی اس فتح میں سب سے زیادہ پیش پیش تھی۔ وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ مصدق کی فتح سے اُس کی فتح کا دامن بندھا ہوا ہے۔

کامل اختیارات کا مطالبہ اور اُسکی منظوری

ملک میں مصدق کی قدرت و اختیار کا حال کیا تھا اُس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہاں ایک اہم نکتہ کا ذکر بہت ضروری ہے ــــ عوام میں تو خیر مصدق کی مقبولیت اور اُس کا اثر و رسوخ اپنے انتہائی عروج پر تھا ہی، سرکاری طور پر بھی گویا اُسے ڈکٹیٹر قبول کر لیا گیا تھا ــــ ۲۱ر جولائی کے انقلاب کے بعد مصدق نے مجلس میں ایک بل پیش کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ جب تک اُسے "کامل اختیارات" نہیں دئے جائیں گے، مالی اور اقتصادی حالات کے درست کرنے کا جو پروگرام حکومت نے طیار کیا ہے اُسے وہ عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ متعدد سینیٹروں نے اس بل کی سخت مخالفت کی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اس قسم کے "کامل اختیارات" اگر ایک وزیر اعظم کے ہاتھ میں دیدئے گئے تو اول یہ کہ شاہ کی پوزیشن پر اس کا بُرا اثر پڑے گا۔ دوسرے دستور کی اساسی کی خلاف ورزی ہوگی۔ تیسرے مجلسِ قانون ساز کی اہمیت کو سخت دھکا لگے گا۔ چوتھے آیندہ کے لئے ایک مُضر نظیر پیدا ہو جائے گی۔ لیکن مجلس کے اندر اور مجلس کے باہر مصدق کے حمایتوں کا زور ایسا تھا کہ اپنی مزید رسوائی اور بدنامی کے ڈر سے سنٹ کو یہ بل پاس کرنا ہی پڑا ــــ چھ ماہ کے خاتمہ کے بعد جنوری ۱۹۵۳ء میں مصدق نے مجلس سے پھر یہ درخواست کی کہ اس "کامل اختیارات" کی مدت کو ایک سال کے لئے بڑھا دیا جائے۔ سنٹ تو تھی نہیں۔ لیکن اب کے خود مجلس کے بعض با اثر ارکان نے مجوزہ توسیع مدت کی پُرزور مخالفت کی۔ خود مجلس کے رئیس (سید) آیت اللہ کاشانی اس بات پر راضی نہ تھے۔ دیگر مخالفوں کی طرح ان کا بھی یہ خیال تھا کہ کامل اختیارات کی توسیع کا نتیجہ اور باتوں کے علاوہ ملک کی مشروطیت کے حق میں بڑا خطرناک ثابت ہوگا۔ لیکن بالآخر اُن کی بھی کچھ نہ چلی اور مصدق کو اور ایک سال کے لئے کامل اختیارات دئے گئے ــــ مصدق کو "کامل اختیارات" پر اصرار کیوں تھا ــــ؟ شاید اُس کا مقصود یہ تھا کہ وہ اس طرح کے غیر معمولی اختیارات کو ایک لمبی مدت تک کے لئے ہاتھ میں لیکر ملک کو شاہ کی ضرورت اور اہمیت کی طرف سے بے پروا اور بے خیال بنا دے ــــ ظاہر ہے کہ عوام کی بت پرست سائکلاجی پر اس بات کا اثر مصدق کے نقطۂ نظر سے مفید پڑتا ــــ یعنی یہ کہ ملک کا حقیقی حکمراں شاہ نہیں ..... اعظم مصدق ہے۔

اقتصادی بحران - مخالفت کا زور

اس دوران میں ملک کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ انگریزوں نے ایران کا اقتصادی محاصرہ کر رکھا تھا۔ تیل کا کارخانہ معطل پڑا ہوا تھا۔ دُنیا کے عام بازار میں تیل کی بکری بند تھی۔

خارجی سکوں کی کمی کی وجہ سے ملک کی تجارت کو نقصان پہونچ رہا تھا۔ "دربار" اور امراء تو مخالف تھا ہی۔ بھاری بھاری سرمایہ دار بھی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ سرکاری حلقے اور عوام میں بہت سے ایسے تھے جو مصدق کی ذات سے تو سچی عقیدت رکھتے تھے مگر اُس کے بعض وزیروں اور مشیروں کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے مصدق کے ایسے معتمدوں میں سب سے پہلا نمبر اُس کے وزیر خارجہ، ڈاکٹر حسین فاطمی کا تھا۔ اُس کے اپنے خصوصی حلقہ کے لوگوں کو چھوڑ کر طہران کے تعلیم یافتہ اشخاص میں کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا۔ سب یہی کہتے مصدق کے تالاب میں فاطمی سب سے زیادہ گندی مچھلی ہے۔

مصدق کے چند ایسے ممتاز اور با اثر رفقاء جو تیل کی صنعت کے قومی بن جانے کے بعد اپنے لیڈر سے داخلی اور معاشی اصلاحات کے متوقع تھے یہ دیکھ کر کہ مصدق اور اس کے رفقاء کا "مقصد" کچھ اور ہے دل برداشتہ ہو کر اُس سے جدا ہونے لگے۔ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ "دربار" اور امریکی سفارت مصدق کے مخالفوں کی "ہمت افزائی" کر رہی تھی۔ ان مخالفوں میں جنرل فضل اللہ زاہدی کا نام (جو اس وقت ایران کا وزیر اعظم ہے) بہت نمایاں تھا۔ جنرل زاہدی، مصدق کی حکومت کے آغاز میں وزیر کشور (ہوم منسٹر) کے عہدہ پر مامور تھا۔ رفتہ رفتہ وہ مصدق کے سیاسی نظریہ کی مخالفت کرنے لگے اور تو دوں کے معاملہ میں مصدق کی نرم رفتاری دیکھ کر اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ آیت اللہ کاشانی بھی جو مذہبی پیشواؤں میں سب سے زیادہ مصدق کے پشتیبان بلکہ دست راست تھے اب وہ بھی مصدق کی داخلی پالیسی پر نکتہ چینی کرنے لگے اور اُن کی پارٹی سے جدا ہو گئے۔ مصدق گروہ کے اخباروں نے جھٹ اُن پر انگریزوں اور "دربار" کا "نمک خوار" ہونے کا الزام لگا دیا۔ ایک اخبار نے ان کا ایک کارٹون بنایا جس میں اُن کے عمامہ پر برطانیہ کے قومی پرچم کی تصویر بنا کر نیچے یہ شعر لکھ دیا:-

بحق لیرۂ جرجیل و پول شاہنشاہ — یقول اشہد اً لا الٰہ اللہ

مصدق کے محکمۂ نشریات نے اس طرح کے پست پروپیگنڈوں کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ خود مصدق نے کاشانی جیسے رفیق کو دوبارہ دوست بنانے کے لئے کوئی قدم اُٹھایا۔ امراء اور سرمایہ داروں کے علاوہ مجتہدوں، ملاؤں اور دین پرست لوگوں کا گروہ تودہ پارٹی کی بڑھتی ہوئی قوت و قدرت سے سخت اندیشہ ناک ہو رہا تھا۔ خود مصدق اس صورت حال سے خوش نہ تھا۔ یہ قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نہ تو مصدق تودوں کا دوست تھا نہ ایران کے کمیونسٹ ہو جانے کا خواہاں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اس پارٹی کے وجود سے زیادہ سے زیادہ فایدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس جماعت کی سرگرمیاں مصدق کے ہاتھ میں امریکنوں کو دھمکانے کا بہترین آلہ تھیں۔ اقتصادی ابتری کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکنے کے لئے مصدق کو مالی امداد کی اشد ضرورت تھی۔ یہ مالی مدد صرف امریکہ ہی دے سکتا تھا اور شاید وہ بڑی آمادگی کے ساتھ ایسا کرتا بھی۔ لیکن انگریز اُسے ایسا کرنے سے روک رہے تھے اور وہ انگلستان کی بات سننے پر مجبور تھا۔ مغربی سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ روس کے خلاف یورپین دفاع اور ایٹلانٹک پیکٹ کو موثر بنانے کے لئے امریکہ کو انگریزوں کی دوستی کی بہرحال ضرورت ہے، اس لئے وہ انگریزوں کے مفاد کے خلاف، خاص طور پر مشرق میانہ میں علانیہ کوئی قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ مصدق کا قیاس یہ تھا کہ اگر اُس نے تودہ پارٹی کی جدوجہد اور سرگرمیوں کی باگ ایک حد تک ڈھیلی چھوڑ دی تو ممکن ہے کہ امریکی حکومت، ایران کی خطرناک صورتِ حال سے گھبرا کر، انگریزوں کے علی الرغم، اس ملک کی مالی امداد کرنے پر راضی ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی سیاست انتہائی پیچیدہ اور مشکل صورتِ حال سے دوچار تھی۔ ایک طرف تو اُن کی کوشش یہ تھی کہ ایران چین نہ ہونے پائے۔ دوسری طرف وہ برطانیہ کی دوستی بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس کشمکش کا نتیجہ روس کے حق میں نہایت مفید ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بظاہر انتہائی بے اعتنائی کے ساتھ ان تمام مناظر کا تماشا کر رہا تھا اور خوش تھا کہ اس قضیہ میں علانیہ مداخلت کئے بغیر ہی اُس کی بازی بڑی کامیابی کے ساتھ کھیلی جا رہی ہے ——— تودوں کے ساتھ مصدق کا یہ "سیاسی بوس و کنار" ملک کے دوسرے لیڈروں کو بالکل پسند نہ تھا۔ وہ اسے ایک خطرناک

رہے تھے ۔ جنرل زاہدی اور اُس کی پارٹی کے لوگ خفیہ طور پر مذہبی حلقوں - شاہی گارڈ کے افسروں اور فوج کے لوگوں میں مصدق کے
وپیگنڈا کرنے لگے - اُن سے کہا گیا کہ مصدق کی حکومت ملک کو انگریزوں سے نجات دلانا نہیں چاہتی بلکہ ایران کو روسیوں کے ہاتھ بیچ ڈالنا چاہتی
وہ گورنمنٹ شاہ اور سلطنت دونوں کی دشمن ہے ۔

افراد کے خاندان کی مہاجرت

مصدق کے مخالف جو کچھ کر رہے تھے، روز بروز اُس کی تائید بھی ہوتی جا رہی تھی۔ "دربار"
کے خلاف مصدق کے تیور اور عوام میں اُس کی محبوبیت کا بڑھتا ہوا جوش دیکھ کر خاندان
افراد بھاگ رہے تھے ۔ شاہ کی ماں، بہنیں اور چند بھائی اپنا مال و اسباب اونے پونے بیچکر ایران کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ کوئی فرانس، کوئی
کوئی امریکہ میں "جلاوطنی" کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ مصدقی گروہ، اشرف پہلوی کو شاہ کی تمام بہنوں میں، اُس کی سوجھ بوجھ، فراست اور
ار" کی وجہ سے خاندان شاہی میں سب سے زیادہ خطرناک سمجھتا تھا، اس لئے اُسے سب سے پہلے ایران چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ شاہ گویا
ت ہواؤں کے درمیان زندگی بسر کر رہا تھا۔ ملک کے تمام اہم امور میں اُس کی حیثیت کنھ پتلی کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ حکومت کا سلوک کچھ ایسا
رجی سیاسی نمایندوں اور تعلیم یافتہ ایرانیوں کی نگاہ میں اُس کا کوئی خاص وقار باقی نہیں رہا تھا۔ اُس کی اس درگت کا ذمہ دار خود شاہ کی
ہرایا جاتا تھا۔ اُس نے امور مملکت سے زیادہ "جذباتی امور" پر وقت صرف کر کے اپنی حیثیت اتنی حقیر اور ناچیز بنالی تھی کہ مصدق کو اُسے دبوچ
لئے زیادہ کوشش سے کام نہیں لینا پڑا، شاہ کے ہمدرد اور حمایتی اس کو ہمت دلاتے مگر وہ ملول اور مرجھائی ہوئی ٹہنی کی طرح گر جاتا۔
ت، طہران کے در و دیوار پر "مرگ بر شاہ" "مردہ باد شاہِ خائن" "برچیدہ باد سلطنت" کے جیسے اہانت آمیز اور انقلابی جملے لکھتی رہتی تھی
نھیں مٹا ڈالنے کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ شاہ پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ خود "شیشہ کے مکان" میں رہنے کی وجہ سے خاندانی آبرو اور
ار کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنی سگی بہنوں کو جارجیوں کے ساتھ شادی کرنے سے روک نہیں سکا۔ شاہزادی فاطمہ کی شادی کسی امریکن سے ہوئی
دی اشرف کی کسی مصری سے ۔۔۔ لیکن غیر سیاسی اور سیدھے سادے عوام جن کے خون میں دیگر ملکی روایات کے ساتھ شاہ اور سلطنت کی محبت
ت گھلی ملی ہوئی تھی، اُن کے حلقہ میں اس طرح کی اہانتیں اور سخت گیریاں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں، وہ کہتے :- شاہ بہرحال شاہ ہے
احترام ملک پر فرض ہے۔ مصدق کے مخالفین ہر جگہ شاہ کی "مظلومیت" اور مصدق کے "ظلم" کا چرچا کرتے پھرتے۔ اگرچہ ملا کاشانی اور شاہ
ت پرانی ان بن ہے اور ملا صاحب کو "دربار" کے ہاتھوں بڑی ذلتیں اور مصیبتیں اُٹھانی پڑی ہیں پھر بھی اب وہ مصدق کے خلاف شاہ کے پشتیبان تھے

فروری ۵۳ء کا ہنگامہ

داخلی اختلافات کی وجہ سے ملک کا حال کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا کہ گزشتہ فروری کے مہینہ میں یہ افواہ شدت
کے ساتھ پھیلنا شروع ہوئی کہ "مصدق کے مسلسل "بے جا اور بے رحمانہ دباؤ" سے شاہ ملک چھوڑ کر کہیں باہر
یا چاہتا ہے ۔ اس افواہ کو حقیقت بنانے والی چیز وہ بیان تھا جو "دربار" کی طرف سے شایع کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ شاہ علاج کی غرض
ر جانا چاہتے ہیں۔ اس بیان پر "دربار" کے حمایتیوں کا گروہ اُٹھ کھڑا ہوا اور شاہ کے حق میں مظاہرے ہونے لگے۔ ممتاز سیاسی لیڈروں اور دیگر بااثر
آیت اللہ کاشانی کے توسط سے شاہ سے درخواست کی کہ وہ ایسے پُرآشوب زمانہ میں ملک کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ شاہ کو اس ارادہ سے باز رکھنے کے
کے معروف خیابانِ بہارستان میں جلسے اور مظاہرے[1] ہونے لگے ۔۔۔ اٹھائیس ۲۸ فروری ۵۳ء کی صبح کو شاہی محل کے نیچے انبوہ در انبوہ لوگوں نے جمع ہو کر
ہ باد" کے نعرے لگائے ۔ کچھ جانباز کفن لپیٹ کر آئے تھے کہ اگر شاہ نے اپنا سفر ملتوی نہیں کیا تو وہ اپنا خون کر ڈالیں گے۔ لوگوں کا "فداکارانہ جذبہ" دیکھکر
ت خود محل کے شہ نشین پر آکر عوام کا شکریہ ادا کیا اور "ملک و ملت" کی خدمت کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہوئے سفر کا ارادہ "فی الحال فسخ" کر دینے کا

ران کا پایۂ تخت ایک جدید طرز کا خوشنما اور صاف و شفاف شہر ہے ۔ لیکن یہاں تین ضروری چیزوں کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے۔ امجدیہ اسٹیڈیم کو چھوڑ کر شہر
یں ایک ورزشگاہ یا میدان بھی نہیں جہاں بچے یا شہر کے نوجوان فٹ بال وغیرہ کھیل سکیں۔ یہاں بچے سڑکوں پر گیند کھیلتے ہیں (۲) سیر و تفریح کے لئے کوئی پارک
) سیاسی جلسوں یا میٹنگ وغیرہ کے لئے کوئی خاص جگہ نہیں۔ تمام ایسے جلسے سڑک پر ہوتے ہیں جسے یہاں خیابان کہتے ہیں ۔

اعلان کیا ـــــ اسی سلسلہ میں مصدق کے مکان پر بھی پہلی دفعہ حملہ ہوا۔ اس حملہ میں فوج کے وہ افسر اور سپاہی نمایاں حصہ لے رہے تھے جنھیں مصدق اپنی قومی تحریک کا مخالف دیکھ کر یا تو انھیں برطرف کر دیا تھا یا اُن کے عہدے چھین لئے تھے یا کم کر دئے تھے۔ یہ دھاوا بڑے زور شور سے کیا گیا تھا اور مصدق کی جان خطرہ میں تھی ..... مگر وہ کسی طرح بچ نکلا۔ ہمیشہ کی طرح اس موقع پر بھی تودوں کی مضبوط جماعت آڑے آئی۔ فوج کے وفادار افسروں نے بھی مصدق کی پشت پناہی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ـــ چونکہ عوام کو شاہ اور شاہ کی "بیچارگی اور مظلومیت" کے نام پر اُٹھایا گیا تھا وہ اُٹھ کھڑے ہوئے ـــ لیکن جونہی شاہ نے باہر جانے کا خیال ترک کر دیا پھر عوام مصدق کے ساتھ ہو گئے۔ بات یہ ہے کہ تودوں کو چھوڑ کر یہاں کے عوام شاہ کو بھی چاہتے تھے اور مصدق کو بھی ـــ تودوں کے لئے مصدق کا عشق ہنگامی اور خود غرضانہ تھا۔ یہ نہ شاہ کو چاہتے تھے نہ مصدق کو ـــ لیکن ان میں اور عوام میں فرق یہ ہے کہ یہ ایک جماعتی حیثیت رکھتے ہیں جو منظم، مرتب اور تربیت یافتہ ہے۔ نیز یہ جماعت اپنا ایک واضح پروگرام رکھتی ہے۔ اس کے برعکس عوام ... یہ نہ منظم ہیں نہ مرتب ـــ اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ مصدق اس لئے مجبور تھا کہ اور مصلحتوں کے علاوہ دوسری غیر منظم پارٹیوں کے مقابلہ میں تودہ پارٹی پر زیادہ اعتماد کرے ـــ خود اُس کی نہضت ملّی پارٹی کوئی خاص منظم شکل نہیں رکھتی تھی۔ خلاصہ یہ کہ پھر مصدق کے حق میں تقریریں اور مظاہرے ہونے لگے پھر "انقلاب زندہ باد" اور "مصدق پیروز است" کی صداؤں سے شہر گونج رہا تھا۔ انگریزوں پر گالیوں اور امریکنوں پر ملامتوں کی بارش ہونے لگی۔ نعرہ یہ تھا کہ "جب تک ہم مغربی استعمار اور سازشوں کے خفیہ اداروں کو ملک کی سرزمین سے اُکھاڑ کر نہیں پھینکدیں گے آرام و اطمینان کی زندگی بسر نہیں کر سکتے" لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۲۸ فروری کے اس واقعہ سے قومی اتحاد و اتفاق کو بڑا نقصان پہونچا۔ مصدق - کاشانی محور تو کمزور ہو ہی چکا تھا، اس ہنگامہ کے بعد بالکل ہی ٹوٹ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے علانیہ مخالف بلکہ دشمن بن بیٹھے۔ ملک کی مجموعی طاقت ٹولیوں میں بٹ گئی۔ دونوں اپنی ذاتی اہمیت، نخوت و خود پسندی کے نشہ میں مست اپنی اپنی گدی پر اکڑ رہے تھے اس ہنگامہ کے بعد ملک کی بدقسمتی سے دو چار داخلی معاملات ایسے پیش آئے جس کی وجہ سے مصدق کے کئی چوٹی کے رفیق شدت کے ساتھ اُس کے مخالف ہو گئے۔ ایسی شخصیتوں میں حسین مکّی - ڈاکٹر بقائی - حائری زادہ وغیرہ کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ صرف تیل کے قومی بنائے جانے میں مہم خدمتیں انجام دی تھیں، بلکہ تیل کے کارخانے سے انگریزوں کے نکالنے میں بھی نمایاں حصہ لیا تھا۔ آج تک یہ بات کسی کے علم میں نہیں کہ شاہ نے ملک سے نکل جانے کا ارادہ حقیقتاً مصدق کے دباؤ سے کیا تھا یا یہ خود "دربار" کی ایک "شاطرانہ" چال تھی جو "کسی اور" کی ہدایت پر چلی گئی تھی۔ اگر بات دوسری ہے اور بڑی حد تک قرین قیاس بھی معلوم ہوتی ہے تو اس میں شک نہیں کہ نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے بڑی موثر و دور اندیشانہ چال تھی۔ جس نے داخلی اختلافات کی رفتار تیز تر کر دی حقیقت یہ ہے کہ ملک کے مزاج اور احساسات کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی آلہ استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہت سے لوگوں کو اس "پردۂ زنگاری میں" "امریکی معشوق" کا چہرہ جھلکتا ہوا نظر آتا تھا ـــ !۔ اس ایک واقعہ کے بعد ملک کی توجہ اور قوت قومی جد و جہد کے مرکز سے ہٹکر شخصی اور داخلی نزاعات پر صرف ہونے لگی۔

یہ سب کچھ ہوا۔ مگر ملک کا بدبخت اور فاقہ کش طبقہ بدستور مصدق کا عاشق اور اُس کی قیادت کا طلبگار رہا۔ طلبہ اور[1] تودہ کی جماعت من حیث الکل مصدق کے پیچھے تھی۔ اب بھی ملک کی بھاری اکثریت کا قول یہی تھا کہ ایران کے ننگے، بھوکے اور تباہ حال عوام کو مدت کے بعد ایک بے غرض شریف اور دلسوز لیڈر ملا ہے۔ انگریزوں کی لائی ہوئی بدبختی اور فلاکت سے اُنھیں صرف مصدق ہی جیسا وطن پرست اور جانباز سپاہی نجات دلا سکتا ہے۔ اُن کا شب و روز کا نعرہ یہ تھا:-

---

[1] طہران اور بعض ممتاز صوبوں کے تمام دبیرستان (اسکول) دانشکدہ (کالج) اور دانشگاہ (یونیورسٹی) (یہاں صرف ایک یونیورسٹی طہران میں ہے) اور طلبہ کا بڑا حصہ یا تو کمیونسٹ ہے یا شخصی حکومت کا مخالف۔

[2] مصدق نے حکومت کے خزانہ سے اپنی تنخواہ یا دیگر سرکاری ضرورتوں کے لئے اپنے تمام دور حکومت میں ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔ اگر تیل کی لڑائی لڑنے کے لئے امریکہ یا ہیگ گیا تو اپنے ذاتی صرف سے۔

از جانِ خود گزشتیم، از خون خود نوشتیم، یا مرگ یا مصدق —! یعنی
ہم جان دے چکے ہیں، خون سے یہ لکھ چکے ہیں، یا مرگ یا مصدق

صرف طہران ہی نہیں دور دراز صوبوں کے کوچہ و بازار میں بھی یہی صدا لگائی جا رہی تھی۔ تودہ، نہضت ملی اور دیگر انقلابی جماعتوں کے اخبارات کے خلاف بدستور زہر اگل رہے تھے — مخالفوں کو قومی آرزوں اور ملی مفاد کا دشمن قرار دیا جا رہا تھا — ایسی حالت میں ہر وہ چیز جو مصدق کی آتی یا جسے مصدق انگریزوں کے لئے مفید اور ملک کے لئے مضر بتلاتا، عوام اُس کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھتے۔ اس طرح مخالف جماعتوں کی سازشیں اور سازشیں کامیاب نہ ہونے پاتیں۔

سلطنت کرتا ہے یا حکومت

بہ حیثیت مجموعی ملک کے عرض و طول میں مصدق کی حکومت کو جتنی مقبولیت حاصل تھی اب مجلس کے اندر اُس کی اتنی ہی شدید مخالفت ہونے لگی تھی۔ "دربار" اور شاہ پسند گروہ کی یاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ مصدق پر شاہ دوستوں کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ اپنے "کامل اختیارات" کی آڑ لیکر مطلق العنان جا رہا ہے۔ نہ اُسے شاہ کا احترام ملحوظ ہے نہ شاہ کے مقام و حیثیت کی پروا۔ اگرچہ ایران کے دستور اساسی کے مطابق تمام طاقتوں اور اختیارات دشاہ ہے نہ کہ وزیر اعظم۔

مصدق نے ریڈیو طہران سے قوم کے نام ایک پیغام نشر کرتے ہوئے ان تمام اعتراضات کا جواب یہ دیا کہ ایران اس وقت اپنی قومی تاریخ کے ایک لی دور سے گزر رہا ہے۔ ایسے نازک موقع پر جبکہ ساری قوم ایک قوی ترین دشمن سے برسرِ پیکار ہے، ملک "دربار" اور شاہ پسندوں کی بیہودہ ں اور رخنہ اندازیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ حریف سے جمکر لڑنے اور اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کے لئے اُسے یکسوئی کی ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ ے سابق وزراء اعظم کے برعکس اُسے قوم نے وزیر اعظم چنا ہے نہ کہ شاہ نے۔ رہا سوال شاہ کے اختیارات کا تو عصر حاضر کی دنیا کے قانون کے مطابق جہاں شخصی حکومتیں قایم ہیں، وہاں شاہ سلطنت کرتا ہے، حکومت نہیں کرتا۔ اس معقول اصول کے خلاف ایران کے بادشاہ ہمیشہ حکومت کے ت میں غیر ضروری دخل انداز کرتے رہے ہیں۔ ملک کا مزاج اب اس طرح کی بیجا مداخلت کو برداشت کرنے پر حاضر نہیں -----

ایران جیسے ملک میں جہاں سالہا سال سے جابر، مستبد اور مطلق العنان بادشاہوں کی حکمراں رہی ہے، مصدق کا یہ انقلابی اعلان ہ سلطنت کرتا ہے، حکومت نہیں کرتا، یقیناً ایک نئی آواز تھی اور اس نے قدرتی طور پر ایک ہلچل پیدا کر دی۔ پرانے خیال کے لوگوں کے کان کھڑے ۔ جاہل عوام کی نگاہیں ترچھی پڑنے لگیں۔ شاہ پرستوں کو پروپیگنڈا کرنے کا ایک اور آلہ ہاتھ لگا۔ مخالف گروہ کے طاقتور لیڈروں مثلاً اہدی۔ آیت اللہ کاشانی۔ حسین مکی۔ ڈاکٹر بقائی۔ حائری زادہ۔ میر اشرفی وغیرہ کی خشونت نے انتہائی شدت اختیار کر لی۔ اِن کے اخبارات پر بے رحمانہ حملے کرنے لگے "شاہ۔ سلطنت کرتا ہے" کا مسئلہ وقت کا نہایت اہم اور پیچیدہ مسئلہ بن گیا۔ شاہ پرستوں نے شور مچایا کہ "یہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ مصدق ڈکٹیٹر بننا چاہتا ہے اور ملک کی مشروطیت کا گلا گھونٹنے پر تلا ہوا ہے" — لیکن مصدق کو اپنے پر اصرار تھا اور وہ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کے لئے طیار نہ تھا۔ آخر مجلس کے موافق اور مخالف ارکان میں سے آٹھ ممبروں پر مشتمل ایک میٹی بنائی گئی اور اس "ٹیڑھے مسئلہ" کا فیصلہ اُس کے حوالہ کیا گیا۔

یہ سے مالی امداد کی اپیل

اِدھر اقتصادی اعتبار سے ملک کی حالت تیزی کے ساتھ گرتی جا رہی تھی۔ گرانی کا عروج تھا۔ زندگی کی آسانیاں گویا مفقود تھیں۔ حکومت ملی بینک سے قرض پر قرض لے رہی تھی۔ اِس پر بھی اکثر و بیشتر ایسا سرکاری ملازموں کی تنخواہیں دیر سے ادا ہوتیں۔ بجٹ نہ ہونے کے سبب کئی سرکاری ادارے وقتی طور پر بند کر دئے گئے تھے — خارجی سکوں ں انتہائی گرانی تک پہونچ گئی تھیں۔ کاغذی نوٹ جتنے چھاپے جا سکتے تھے، چھاپے جا رہے تھے — یہ صورتِ حال تودہ پارٹی کے لئے بڑی رثابت ہو رہی تھیں۔ وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فایدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھی — مصدق نے اقتصادی تناؤ کو ڈھیلا کرنے کا شرر راستہ نہ دیکھ کر پریسیڈنٹ آئزن ہاور کو ایک کھلی چٹھی لکھی کہ اُسے ایران کے بڑھتے ہوئے اقتصادی بحران کو دور کرنے کے لئے مالی امداد

کی فوری ضرورت ہے۔ اگر یہ امداد جلد سے جلد نہیں پہونچتی تو اس ملک کو "بڑے خطرات" کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ۹ر جولائی ۱۹۵۳ء کو آئزن ہاور نے اس "پیام" کا جو جواب دیا وہ اس بات کا صاف آئینہ دار تھا کہ امریکہ، برطانیہ کی دوستی پر ایران کی دوستی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اسے انگلستان کے سامنے جھک جانا چاہئے۔ اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ "فی الحال پوائنٹ فور اور ملیٹری ایڈ کے پروگرام کے تحت ایران کو جو کچھ مدد دی جارہی ہے امریکن پبلک اس سے زیادہ کچھ اور دینا اپنے اوپر ایک ناجائز بار سمجھتی ہے۔ امریکی شہریوں کا خیال یہ ہے کہ ایران اپنی تیل کی صنعت کو بروئے کار لاکر اپنی مالی مشکلات دور کرسکتا ہے۔۔۔۔۔ اور تیل کے قضیے کو حل کرنے کے بے شمار قانونی راستے موجود ہیں۔۔۔۔۔"

امریکہ کا یہ جواب مصدق کے لئے بڑا ہی مایوسانہ تھا۔ اس دوٹوک جواب نے اُس کے مخالفوں کے بازو بہت قوی کردئے۔۔۔۔۔ اور شاید اس جواب کا مقصود حقیقی بھی یہی تھا ـــــ ان سب پر مستزاد مصدق کے "کامل اختیارات" کی مدت تیزی کے ساتھ ختم ہوتی جارہی تھی۔ مجلس میں حزب مخالف کی شدید اور سخت گیریاں بڑھتی جارہی تھیں۔ جنرل زاہدی جس کی ریشہ دوانیاں مصدق کے لئے بڑی خطرناک صورت اختیار کرتی جارہی تھی، مجلس کے احاطہ میں پناہ گیر تھا۔ ایرانی قانون کے مطابق حکومتِ وقت مجلس کے کسی رکن کو ایسی جائے پناہ سے جبراً نہیں گرفتار کرسکتی۔ اُسے اُس وقت تک گرفتار کرسکتی ہے جب تک کے مجلس کے خاتمہ کی مدت باقی ہے۔ ہاں مجلس اپنی میعاد اور عمر سے پہلے اگر کسی وجہ سے توڑ دی جائے تو پھر ایسے پناہ گیر ارکان کی گرفتاری عمل میں لائی جاسکتی ہے ـــــ مجلس میں مخالف پارٹی کے ارکان کا پرزور تقاضا یہ تھا کہ مصدق سے باقاعدہ باز پرس کرنا چاہئے، کیونکہ "جاہ طلبی کے مجنونانہ جوش" میں اُس نے قومی تحریک اور ملکی اقتصادیات کو سخت نقصان پہونچایا ہے۔ چونکہ مجلس میں اس باز پرس کی کارروائی کا اندیشہ، نیز زاہدی اور اُس کے ساتھ چند اور خطرناک مخالفوں کا تو مجلس میں پناہ لے لینا مصدق کے لئے مصیبت خیز چیز بنی ہوئی تھی، عام طور پر یہ کہا جارہا تھا کہ مصدق کا عتاب جلد ہی مجلس پر نازل ہونے والا ہے۔ سنٹ کی طرح مجلس بھی توڑ دی جائے گی۔۔۔۔۔ مصدق ایسی "دشمن مجلس" کو برداشت نہیں کرسکتا اور جب تک وہ مخالفوں کے سرغنہ جنرل زاہدی کو گرفتار کرکے جیل میں نہیں ڈال لیتا اس وقت تک سکھ کی نیند نہیں سو سکتا۔

۳ر اگست کی تاریخی رائے شماری

چنانچہ مجلس کو اُس کی "فطری عمر" سے قبل ختم کردینے کے لئے مصدق کے حمایتوں نے جو پہلا قدم اُٹھایا وہ یہ تھا کہ ۱۴ ـ ۱۹ر جولائی کے درمیان نہضت ملی پارٹی کے چھپن ۵۶ افراد نے مجلس کی ممبری سے استعفا دیدیا۔ اس کا سبب یہ بتلایا گیا کہ "حزب مخالف" کے مخاصمانہ حملوں نے مجلس کی فضا کچھ ایسی خراب کردی ہے کہ پارلیمنٹری طور پر حکومت چلانا ناممکن سا ہوگیا ہے۔" ان ارکان کے مستعفی ہوجانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس میں صرف تیس ۳۰ ارکان باقی بچ گئے، اور یہ تقریباً سب کے سب مصدق کے معاند و مخالف تھے، ستائیس ۲۷ جولائی کو مصدق نے ریڈیو سے ایک پیغام نشر کیا اور اُس میں مجلس کے توڑ دئے جانے کی تجویز پیش کی۔ اُس نے کہا: "موجودہ مجلس غداروں اور اجنبی پرستوں کا ایک مستحکم قلعہ بن کر رہ گئی ہے۔ اُس کا معاندانہ رویہ قومی کاموں کے انجام میں مشکلات پیدا کررہا ہے۔ حکومت اس معاملۂ خاص میں قوم سے یہ رائے لینا چاہتی کہ آیا وہ اس مجلس کی بقا کے حق میں ہیں یا ایک ایسی مجلس بنانا چاہتے ہیں جو حکومت کی حمایتی اور ملکی مفاد اور مقصود سے سچی ہمدردی رکھتی ہو ـــــ"

"دربار" اور مصدق کے تمام مخالفوں نے ملکر اس رائے شماری کو روکنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتے تھے۔ ایران کے ممتاز العصر مجتہد آیت اللہ بہبہانی خود مصدق سے ملے اور اُسے رفرنڈم کے خیال سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ جب اس ذاتی التماس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تو انھوں نے مصدق کو دھمکی دی کہ وہ رائے شماری کے خلاف فتویٰ صادر کرنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا آیت اللہ العظمیٰ نے علانیہ اِس خیال کی تکفیر کی۔ ملک کے دوسرے مذہبی۔ سیاسی پیشوا حضرت آیت اللہ کاشانی نے "قرآنی آیات" کی روشنی میں اس رائے شماری کو "قطعاً حرام" قرار دیا اور "عموم مسلمین" سے اپیل کی کہ وہ اس "غیر مشروع اور سراسر غیر اسلامی" فعل میں کوئی حصہ نہ لیں۔ شاید قارئین کو یاد ہو کہ ایک سال قبل کاشانی نے قوام السلطنۃ کے وزیر اعظم منتخب ہونے کی پُرزور مخالفت کی تھی۔ اُسوقت یہی صدا کچھ ایسی موثر ثابت ہوئی تھی کہ توپ و تفنگ کے باوجود قوام چار گھنٹے بھی اپنی مسند حکومت پر چین سے بیٹھنے نہ پایا۔ اس موقع پر

انی کے علاوہ جہاں تشیع کی ایک اور محترم اور زبردست مذہبی شخصیت نے مصدق کے خلاف آواز اُٹھائی تھی۔ لیکن اِس اسلامی ملک
جاری اکثریت نے اس فتویٰ کا کوئی لحاظ نہیں۔ تقریباً طہران کے چورانوے ۹۴ فیصدی عوام نے اس رائے شماری کی "معصیت" میں کھلے بندوں
لیا۔ بعض ووٹ دینے والوں سے کسی نے پوچھا:۔ "تعجب ہے آپ اپنے بزرگان دین کے فتووں کے خلاف اس رفرنڈم میں حصّہ لے رہے
" انھوں نے بے پروائی سے جواب دیا:۔ "نباید آخوندھا (علماء دین) بہ سیاست کار داشتہ باشند۔ اِنہا بیخود (یعنی فضول) دراین چیزہا
الت میکنند۔ باید کار ایں جماعت نماز روزہ باشد ــــ"[۵۱]

خلاصہ یہ کہ ۳ راگست ۵۳ء کو طہران کے عوام نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ وہ موجودہ مجلس کے قیام کے حق میں نہیں۔ ملک کے بقیہ حصّوں میں
فرنڈم ۱۰ راگست کو انجام پایا۔ وہاں کے عوام کی زیادہ رائے بھی یہی تھی ــــ کہ موجودہ مجلس توڑ دی جائے ۔۔۔۔۔۔ "ایرانی عوام کسی ایسی
ساط" کے وجود کو قبول نہیں کر سکتے جو مصدق کی ملّی حکومت کے راستہ میں موانع اور مشکلات پیدا کرتی ہو ــــ"

۹ راگست کو حزب مخالف کے متعدد ارکان نے (جو یا تو مجلس میں پناہ گیر تھے یا آیت اللہ کاشانی کے مکان میں) انجمن اقوام متحدہ
۷۰ ۷۰) کو اس رائے شماری کے خلاف پُرزور احتجاجی تار بھیجا۔ اس میں کہا گیا کہ "یہ رفرنڈم نہ تھا بلکہ ایک ڈھونگ تھا۔ جسے جائز کہا جا سکتا
انونی۔ یہ محض "قلابی" (FARCE) رفرنڈم تھا ــــ مصدق پر مزید الزام یہ لگایا گیا کہ وہ "مخالف پارٹیوں اور پریس کو کچل کر حقوق بشری
لا گھونٹ رہا ہے ــــ" اس احتجاجی تار میں جو کچھ کہا گیا ہے بڑی حد تک اُس کی سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جن لوگوں کو اس رائے شماری
اڈوں کے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ اس کی تصدیق کریں گے ۔ ظاہر ہے کہ جو رائے شماری بھی حکومتِ وقت کے زیر اثر انجام پائے گی اُسے
ی طرح بے لاگ اور آزاد نہیں کہا جا سکتا[۵۲] ــــ لیکن پالیٹکس ایک گندہ کھیل ہے اور پالیٹیشن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ حق پرستی، راست بازی
دیانتداری کے صفات بھی رکھتا ہو۔ اس راہ میں اصل شئے مقصد ہے۔ اور مقصد جس طریقہ سے بھی حاصل ہو سیاست میں بجا اور جائز سمجھا
ہے۔ سیاست کو اخلاق کی کسوٹی پر کسنا صحیح نہیں، مصدق اگر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاتا تو دُنیا کے ممتاز سیاست دانوں میں اُس کا

---

[۵۱] اگر ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان مشرق میانہ کی سیاحت کریں تو یہ حقیقت اُن پر روشن ہو جائے کہ کسی اسلامی مملکت میں وہ مذہبی تعصب اور
شف نہیں پایا جاتا جو اقلیم ہندو پاکستان کے عام مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہے ــــ نہ اس علاقہ کے کسی ملک میں پردہ ہے نہ شراب و سور کے گوشت کے خرید و
حت یا استعمال پر کوئی خاص قدغن۔ اکثر سڑکیں ایسی ہیں جہاں سینما گھر اور مسجد بالکل آمنے سامنے ہیں۔ سینما کے شوقین اُدھر چلے جاتے ہیں۔ نماز کے پابند اِدھر
تے ہیں۔ مغرب اور عشا کے وقت اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مغنیہ کی صدائیں اور تکبیر کے نعرے ایک ساتھ بلند ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی اس کی پروا بھی نہیں کرتا۔ "مسجد
سامنے باجا بجانا" یہاں کہیں ممنوع نہیں سمجھا جاتا۔ ویسے نمازیوں کے احترام و لحاظ کی وجہ سے کوئی باجا نہ بجائے یہ اور بات ہے۔ محرم کی عام مجلسوں میں شرفا
ی شرکت نہیں کرتے۔ تعزیہ کا تو خیر یہاں کوئی تصور نہیں۔ ہاں عَلَم اور سپر نکلتے ہیں جن کو ایرانی اصطلاح میں نشان اور علامت کہا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں
مراء کا طبقہ نشان اور علامت کے جلوس یا دستوں میں شریک نہیں ہوتا۔ یہ چیز یہاں تیسرے اور چوتھے درجوں کے افراد کے لئے مخصوص ہے۔ وہی لوگ
نہ دسر کوٹتے ہوئے ایسے دستوں کے ساتھ نکلتے ہیں۔

گائے کا گوشت یہاں صحت کے لئے سخت مضر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کا غریب طبقہ بھی اس گوشت کو پسند نہیں کرتا۔ اس سلسلہ میں یہ مقولہ بہت مشہور
: ــ ماہی، ماہ بہ ماہی، گوشتِ گوسفند ہر صباحی، گوشت گاؤ ہیچ وقت نہ آرید۔

[۵۲] پروپیگنڈا کے دو مہم و موثر آلے اور وسیلے ریڈیو اور پریس ہیں۔ مصدق کی حکومت میں جب سے ڈاکٹر حسین فاطمی وزیر امور خارجہ مقرر ہوا تھا اُس نے
دونوں اداروں کا کنٹرول خاص طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا ــــ ریڈیو تو یہاں ویسے بھی ہمیشہ گورنمنٹ کے کنٹرول میں رہتا ہے، رہا پریس تو کثیر الاشاعت
ارات کی پالیسی ہر نئی حکومت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ جیسی گورنمنٹ ہوئی یہ اپنے کو ویسا ہی ڈھال لیتے ہیں۔ بقول ان کے مدیروں کے "ہم اگر ایسا نہ کریں
لومت کے ہاتھوں بند یا برباد کر دئے جائیں ــــ" (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ فرمائیے)

شمار کیا جاتا اور "ریپبلکن ایران" کا مورخ اُسے خراج تحسین پیش کرتا ــــ علاوہ برایں اُس کے مخالفین اگر اُس کی جگہ پر ہوتے نیز یہ کہ پریس اور ریڈیو پر بھی اُن کا کنٹرول ہوتا تو کیا ان کا طریقہ عمل کچھ اور ہوتا ــــ ؟ کیا وہ اس طرح کی رائے شماری میں کامل دیانت اور صفائی سے کام لیتے ؟ کیا جنرل زاہدی کی موجودہ حکومت مصدق کے حمایتوں اور ہمدردوں کے ساتھ عدالت اور انصاف کا برتاؤ کر رہی ہے ــــ ؟ اللہ کی اس دنیا میں بے لاگ صداقت اور سچائی کا وجود کہاں ہے۔

بہرکیف، صورتِ حال کچھ بھی رہی ہو۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بجلیوں کی کڑک اور طوفانوں کی گرج کے باوجود مصدق نے اپنی کشتی کنارے لگا کے چھوڑی۔ اب تک اُس کے سارے منصوبے نہایت خوبی کے ساتھ کامیاب ہوتے چلے آرہے تھے۔ یہ آخری فتح سب سے زیادہ شاندار اور غیر معمولی فتح تھی جو اُسے حاصل ہوئی۔

مجلس کا انحلال۔ شاہ کا فرار

ایرانی قانون کے مطابق ڈاکٹر مصدق نے شاہ سے کہا کہ وہ رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے مجلس کے توڑ دینے کا فرمان صادر کر دے۔ شاہ نے ایسا کرنے سے یکقلم انکار کیا۔ شاہ کا در پردہ اور شاہ دوستوں کا علانیہ اعتراض یہ تھا کہ اول تو یہ رائے شماری اصولاً غلط تھی دوسرے یہ کہ صاف اور بے لاگ طریقہ پر نہیں کی گئی تھی۔ ایسی حالت میں مجلس کا انحلال کوئی معنی نہیں رکھتا ــــ نہضت ملی کے لیڈروں نے شاہ کے طرزِ عمل پر سخت غصہ اور برہمی کا اظہار کیا ــــ شاہ کے انکار کی کوئی پروا نہ کر کے مصدق نے خود ۱۲ اگست کو مجلس کے خاتمہ کا اعلان جاری کر دیا ــــ اب مصدق کے اُن مخالفوں کا جو مجلس کی عمارت میں پناہ گیر تھے وہاں ٹکا رہنا ناممکن ہو گیا۔ جنرل زاہدی فرار کر کے طہران کے کسی نامعلوم گوشہ میں مخفی ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کے ساتھ اُس کے اور رفقا بھی مجلس کے احاطہ سے بھاگ نکلے۔ زاہدی کا اس طرح غائب ہو جانا حکومت کے لئے بڑا ہی اندیشہ ناک تھا۔ اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے پے در پے اعلان کیا جانے لگا کہ جو شخص بھی زاہدی کا پتہ بتائے گا یا اُس کے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گا اُسے حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپیہ کا انعام دیا جائے گا۔ خود جنرل زاہدی کے نام یہ نوٹس نشر کی گئی کہ وہ ایران کے جس گوشہ میں بھی ہو اُسے جلد سے جلد اپنے کو حکومت کے حوالہ کر دینا چاہئے وگرنہ اگر وہ پکڑا گیا تو اُسے سخت سے سخت سزا بھگتنا پڑے گی۔

مجلس کا توڑ دیا جانا ایک سمجھی بوجھی ہوئی سی بات تھی، امن عامہ پر اس عمل کا کوئی غیر معمولی اثر نہیں پڑا۔ لوگ جانتے تھے کہ شاہ کی رضامندی یا نارضامندی کوئی اہمیت نہیں رکھتی، مصدق جو چاہے گا کر گزرے گا۔ اب کم و بیش ہر شخص کی زبان پر یہی تھا شاہ اور سلطنت دونوں کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ یا تو شاہ کو ایک "دستوری شاہ" بن کر رہنا پڑے گا یا ملک کا نظام جمہوری بنا دیا جائے گا۔ ویسے تو جب سے شاہ اور مصدق کے اختلافات بڑھنا شروع ہوئے اور مصدق کے مخالفوں کا گروہ اپنی سرگرمیاں بڑھاتا جا رہا تھا، یہ بات اکثر سننے میں آتی تھی کہ شاہی گارڈ (جس کی تعداد اٹھارہ ہزار مسلح سپاہیوں کی ہے) اور فوج کے معزول شدہ افسر اور سپاہی ملک میں کودتا (COUP DE TAT) یا انقلاب ناگہانی کے ذریعہ مصدق کی حکومت کو اُٹھا پھینکنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بھی سُنا جا رہا تھا کہ انگریزوں اور امریکنوں کے جاسوس بھی گرم کار ہیں۔ ایک امریکی جنرل "شوارزکف" جو کبھی ایرانی فوج کا افسر اعلیٰ رہ چکا تھا وہ بھی رائے شماری سے کچھ دنوں قبل ایران آیا اور شاہ سے تنہا ملا۔ اُنھیں دنوں اشرف پہلوی بھی

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۱) ــــ چونکہ ایران کے ممتاز اخباروں کے مالک بڑے بڑے سرمایہ دار اور شاہ پرست ہیں اس لئے وہ اوّل اوّل تو مصدق کی مخالفت کر رہے تھے اور تیل کے تصفیہ کے سلسلہ میں نرم رفتاری کے حامی تھے۔ لیکن بعد میں جب مصدق کا جاہ و جلال عوام میں بڑھنے لگا تو ایسے کل اخبارات اُس کی پالیسی کا ساتھ دینے لگے۔ ڈاکٹر حسین فاطمی ایسے تمام شاہ پرست اور ثروتمند اخبار نویسوں کا جانی اور کھلا ہوا دشمن تھا۔ وہ ان کی سرکوبی کے لئے ہمیشہ آمادہ رہتا ــــ ایسے اڈیٹر اور پروپرائٹر جو چھوٹی پونجی والے تھے وہ ساری دھمکیوں اور نقصانات کے باوجود آخر وقت تک مخالفت پر جمے رہے۔ لیکن وہ مدیران جرائد جن کے دفاتر بڑے اور پھیلے ہوئے ہیں اور خود بھی معزز حیثیتوں کے مالک ہیں، اُن کے لئے جُھک جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اُن کے دل تو مصدق کی نفرت اور عداوت سے بھرے ہوئے تھے مگر قلم سے اُس کی پالیسی اور پیشوائی کی قصیدہ خوانی کرتے رہتے۔

پیرس کی جلاوطنی" سے "بغیر کسی اطلاع" کے طہران آئی۔ طہران کے ہوائی اڈے پر جب لوگوں نے اُسے پہچانا اور بغیر کسی خبر کے اس طرح گمنام طور ر وہونے کا سبب پوچھا تو اُس نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا کہ اس کا اکلوتا بچہ ہڈیوں کی سل میں مبتلا ہے اُس کے علاج کے لئے روپوں ر میں اسے مجبوراً ایران آنا پڑا ہے۔ حکومت پر اشرف کے خفیہ طور پر آنے کی دہشت کچھ اس قدر چھائی کہ اُسے چار روز کے اندر اندر طہران سے لوٹ پڑا ۔۔۔۔۔۔۔ غرض مصدق کی حکومت کے خلاف خفیہ سازشوں کے قصہ تو سننے میں آتے تھے لیکن بظاہر اُن کے کامیاب ہونے کا کوئی امکان نہیں آتا تھا ۔۔۔۔۔۔۔ لیکن ۱۶ر اگست، اتوار کی صبح ۷ بجے طہران ریڈیو نے یہ حیرت ناک خبر براڈ کاسٹ کی کہ شاہی گارڈ مصدق کی حکومت خلاف "کودتا" کرنا چاہتا تھا مگر یہ سازش کامیاب نہ ہوسکی اور سارا راز فاش ہوگیا۔ ریڈیو نے یہ بھی اضافہ کیا کہ شاہی گارڈ کے افسر ڈاکٹر مصدق گرفتار نہیں کر پائے مگر وزیر خارجہ ڈاکٹر حسین فاطمی اور نہضت ملی کے دوسرے لیڈروں کے گھر پر شبخون مارا اور انھیں گرفتار کرنے میں کامیاب ئے ۔۔۔ اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان کی جاتی ہے کہ جب شاہ نے صاف طور پر یہ سمجھ لیا کہ اب اُس کی شاہنشاہیت کے دن تمام ہو چکے تو اُس نے اپنے "مشیرانِ خاص" اور شاہی گارڈ کے افسران اعلیٰ کے مشورہ سے تین احکامات صادر کئے :۔

اول - ڈاکٹر محمد مصدق کو وزیر اعظم کے عہدہ سے معزول کیا جاتا ہے

دوم - جنرل زاہدی کو ایران کا وزیر اعظم مقرر کیا جاتا ہے۔

سوم - جنرل ریاحی (ایرانی فوج کا کمانڈر) کو معزول کر کے اُس کی جگہ جنرل باتمنقلیچ کو ایرانی فوج کا افسر مقرر کیا جاتا ہے۔

۱۵ر اگست، سنیچر کی رات کو، کوئی ساڑھے گیارہ بجے کرنل نصیری (شاہی گارڈ کا افسر اعلیٰ) شاہی فرمان لیکر فوجی ٹرک لیکر پہلے جنرل نی کے دفتر میں جاتا ہے۔ جنرل ریاحی کو وہاں موجود نہیں پاتا ۔۔۔۔۔ مگر اُس کے نائب جنرل کیانی کو گرفتار کر لیتا ہے۔ پھر کرنل نصیری تین ٹرک کے ساتھ مصدق کے مکان کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ مصدق کے مکان کے مسلح پہرہ دار مزاحم ہوتے ہیں۔ کرنل نصیری اُن سے کہتا ہے شاہ کی طرف سے وزیر اعظم کے نام ایک فوری اور خفیہ چٹھی لایا ہے جسے وہ خود ڈاکٹر مصدق کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہے۔ مصدق کے مکان ک پہرہ دار ملیٹری افسر شاہی محل کا لفافہ دیکھ کر مصدق کو مطلع کرتا ہے۔ مصدق کی اجازت سے کرنل نصیری اندر آتا ہے اور مصدق کو ع کرتا ہے۔ مصدق کی اجازت سے کرنل نصیری اندر آتا ہے اور مصدق کو شاہی لفافہ دیتا ہے۔ جونہی مصدق اپنی معزولی کا حکم پڑھتا اپنے فوجی محافظ کو حکم دیتا ہے کہ وہ کرنل نصیری کو فوراً حراست میں لیلے۔ کرنل نصیری کے فوجی رفقا ٹیلیفون سے اس کی گرفتاری کی خبر ر کو دیتے ہیں اور خود جنرل ریاحی کے ہاتھوں گرفتار ہو کر زنداں میں ڈال دئے جاتے ہیں۔ زنداں میں ان سپاہیوں کے ساتھ انتہائی سختی ناؤ کیا جاتا ہے۔

شاہ تو اپنی کم حوصلگی اور نرم ہمتی کے لئے مشہور تھا ہی (لیکن شاید حالات کا تقاضا بھی یہی تھا) وہ اس فرمان پر دستخط کر کے مخصوص ہوائی جہاز سے، ملکۂ ثریا کو ساتھ لیکر ایران کی شمالی سیرگاہ کلارہ دشت چلا جاتا ہے جو بحر اخضر سے کنارے واقع ہے اور ران سے سوا سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ اور اس کے مشیروں میں یہ بات طے پا چکی تھی کہ اگر "کودتا" کامیاب ہوا تو وہ طہران لوٹ آئے گا ورنہ بہ حالت دیگر وہ اُسی طرف سے کسی اور ملک کو نکل جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہوا۔ ۱۷ر اگست کی شام ہوتے ہوتے یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ شاہ ایران چھوڑ کر بغداد بھاگ گیا۔ سب سے پہلے یہ خبر آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ ایران پہنچی "کودتا" ر سے طہران کی حالت بحرانی اور ہنگامہ خیز ہو ہی رہی تھی، شاہ کے فرار کی خبر نے مزید سنسنی پھیلا دی۔ جو سنتا مبہوت رہ جاتا ۔۔۔۔ ں بایں ہمہ امن عامہ پر اس ڈرامائی واقعہ کا کوئی فوری ردعمل نہیں ہوا ۔۔۔ ایسا محسوس ہوتا تھا عوام اس تغیر اور انقلاب کے لئے پہلے سے طیار تھے۔

شاہ کے فرار کے دوسرے ہی روز سے مقامی اخباروں میں مصدق کے آیندہ اقدامات کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے ں ۔۔۔۔ لوگ سمجھتے تھے کہ ابھی کچھ دنوں تو صورت حال میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی جائے گی، مگر چونکہ شاہ تخت چھوڑ چکا ہے اسلئے

مصدق بھی وہی راہ اختیار کرے گا جو سال گزشتہ شاہ فاروق کے مصر سے نکال دئے جانے کے بعد جنرل نجیب نے اختیار کی تھی یعنی ملک کے انتظامات کی باگ ڈور ہنگامی طور پر ایک شورائی عالی قایم کرکے اُس کے سپرد کردی جائے گی۔ یہ صرف گمان ہی نہ تھا بلکہ حقیقتاً خود حکومت کے قدم اسی راہ پر اُٹھنے لگے تھے۔ سرکاری اخباروں میں صاف طور پر یہ لکھا جارہا تھا کہ مصدق ایک اور رفرانڈم کرانا چاہتا ہے جس کے ذریعہ عوام سے یہ رائے لیجائے گی کہ وہ جمہوری نظام حکومت کے حق میں ہیں یا نہیں"۔ تقریباً ہر شخص کا خیال یہ تھا کہ اگلی رائے شماری کی طرح اب کے بھی مصدق کی کامیابی یقینی ہے۔ ایران میں بھی مصر ہی کی طرح کہا جارہا تھا کہ ایران کی چھ ہزار سالہ شخصی حکومت کا عہد ختم ہوا اور اب اس ملک کی تاریخ ایک نیا ورق اُلٹنا چاہتی ہے ـــــ لیکن وقت کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا۔

حسین فاطمی کی زیادتیاں

ایسے نازک اور احتیاط طلب موقع پر تودوں (کمیونسٹوں) اور وزیر خارجہ ڈاکٹر حسین فاطمی نے کچھ ایسا جارحانہ رویہ اختیار کیا اور پے در پے چند ایسی فاش، بھدّی اور اشتعال انگیز غلطیاں کیں جن کا اثر بالکل قدرتی طور پر ملک کے نفسیاتی اور جذباتی مزاج پر اُلٹا پڑا اور موافق دھاروں کا رخ دفعتاً بدل گیا ـــــ!

پہلی غلطی۔ فاطمی کی تھی کہ اگرچہ وہ ایک ذمہ دار عہدہ کا مالک یعنی وزیر خارجہ تھا پھر بھی اُس نے اپنے دستخط سے اپنے روزانہ اخبار باختر امروز میں شاہ اور "دربار" کے خلاف شاہ کے فرار ہی کے دن یعنی ۱۶ اگست کو ایک نہایت رکیک اور نامہذب اڈیٹوریل لکھا جس کا عنوان یہ ہے :- "ایں دربار شاہنشاہی روئے دربار سیاہِ فاروق را سفید کرد۔ اس اداریہ میں فاطمی نے "کودتا" کی مذمت کرتے ہوئے شاہ کو غدار، انگریزوں کا نوکر، سیہ کار، بے شرم وغیرہ کے القاب سے یاد کیا۔ اس کے علاوہ درباری امراء اور شاہی گارڈ کے افسروں کو وہ سب کچھ کہا جو وزیر خارجہ کی حیثیت سے اُسے نہیں کہنا چاہئے تھا۔ اس مقالہ کے بعد فاطمی نے یکے بعد دیگرے دو اور اڈیٹوریل لکھے جس میں شاہ کے ساتھ اُس کے مرحوم باپ رضا شاہ اور خاندان شاہی کے دیگر محترم افراد کو بُرا بھلا کہا۔

دوسری غلطی :- تودہ پارٹی اور دیگر انقلابی جماعتوں کے افراد کی تھی جو شہر کے کوچہ و بازار میں اپنی فتح و ظفر کا پرچم لہراتے پھر رہے تھے ـــ ان کے فلک شگاف نعرے یہ تھے :- "برچیدہ باد سلطنت۔ سرنگوں باد شاہ۔ ما شاہ نمی خواہیم۔ بہ یک جنبش تودہ شاہ فراری شد"۔ ایسی حالت میں شاہ کے فرار کے دوسرے روز طہران کے ایک عظیم الشان جلسہ میں فاطمی نے ایک دھواں دھار تقریر کے دوران میں لوگوں کو عام اجازت دیدی کہ وہ موجودہ اور سابق شاہ، رضا شاہ پہلوی کے مجسموں کو شہر کے پارکوں اور چوراہوں سے اُکھاڑ کر پھینکدیں اس لئے کہ "ما ایرانیان ملت بُت پرست نیستیم"۔ تودہ پارٹی اور دوسرے انقلابی دستوں نے جو یہ شہ پائی تو ایک ایک مجسمہ نیز شاہ اور شاہ کے باپ کی تصویروں کو دکانوں اور قہوہ خانوں سے اہانت اور ذلت کے ساتھ نوچ نوچ کر پھینکنا شروع کیا۔ فاطمی کے اخبار نے موجودہ شاہ اور رضا شاہ مرحوم کے شاندار مجسموں کے توڑے جانے کی تصویریں سرورق پر شایع کیں اور نیچے یہ عبارت لکھدی :- پس از دو سال عصر دیروز اثری از بُت ہائی خاندان پہلوی در میدانہائی مختلف شہر دیدہ نمی شد۔ ما پیشنہاد (تجویز) میکنیم کہ مجسمہ ہائے دیکتاتورِ (ڈکٹیٹر) سیاہ کار را برائے ضبط در موزہ (میوزیم) جنایاتِ (جرائم۔ معاصی) خاندان پہلوی نگاہداری (حفاظت) کنید۔

تیسری غلطی :- فاطمی کی تیسری اور آخری غلطی، مگر طغیان اور حماقت میں اوپر کی دو غلطیوں سے کسی طرح کم نہیں، یہ تھی کہ ایرانی فوج اور شاہی گارڈ کے سپاہیوں میں ایک زمانہ سے ہر صبح و شام بطور دعا یا شگون، "شاہ ہُرّرا" کہنے کی رسم چلی آتی ہے۔ یہ ایک طرح کا دعایہ نعرہ ہے جسے ہر فوجی عادتاً شاہ کے طول عمر اور اپنے جذبۂ وفاداری کا اظہار کرنے کے لئے لگایا کرتا ہے ـــ فاطمی کے زور اور دباؤ سے یہ دعا یکلخت بند کرادی گئی ـــ فوجیوں کو یہ حکم دیدیا گیا کہ اس دعا کی جگہ وہ اب ہر صبح و شام "ملت ہُرّرا" کا نعرہ لگایا کریں۔

ان باتوں کے علاوہ سرکاری اخبار باختر امروز نے پورے صفحہ کی سُرخی دیکر یہ اعلان کیا کہ "دربار اور شاہی گارڈ کے جن افسروں نے "کودتا" میں حصہ لیا ہے انھیں جلد ہی پھانسی کے تختوں پر لٹکایا جائے گا"۔ فاطمی کے گل فحش مقالے اور اس کی اشتعال انگیز تقریر ریڈیو طہران سے شد و مد کے ساتھ براڈکاسٹ کئے گئے۔

شاہ کے طرفداروں (رائلسٹ) کا گروہ ایسی ساری باتوں سے قدرتاً زیادہ سے زیادہ فایدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جنرل زاہدی اور سایتی، فوجیوں، شاہی گارڈ، ملاؤں، مذہبی عوام اور تجّار وغیرہ کے حلقوں میں یہ دہشت پھیلا رہے تھے کہ مصدق، فاطمی جیسے عامی تودہ پارٹی کا کھلونا بنا ہوا ہے۔ وہ ضعیف العمر تو ہے ہی، اُس کے مشیر کار اور وزراء اُسے اُنگلیوں پر نچا رہے ہیں۔ ملک کو جمہوری بنانے کا خواب عبث ریت کے بعد کا دوسرا قدم کمیونزم ہے۔ حالات کچھ ایسے ہیں، اور ایران کی جغرافیائی پوزیشن کچھ اس طرح کی ہے کہ جمہوریت کے بعد دُنیا کی کوئی ران کو کمیونسٹ بن جانے سے نہیں روک سکتی۔ یہ یقینی ہے کہ ملک روسی حلقۂ اثر میں آکر ہمیشہ کے لئے "پردہ آہنی" کے اندر چلا جائے گا۔ اس ہمارے قومی آزادی کا خاتمہ ہے، نہ خدا ہوگا، نہ مذہب، نہ نماز نہ روزہ، نہ مجلس نہ ماتم ـــ مختصر یہ کہ ہماری حیات قومی کا سارا شیرازہ جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

۱۸ اگست منگل کی شام سے شہری زندگی کا مطلع کچھ غبار آلود سا ہونے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دارالسلطنت کی فضا کچھ بدلی بدلی سی نظر آنے م کے تیور میں بین فرق تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شہر کے دو تین اہم مقامات سے یہ خبر آنے لگی کہ "درخیابانہا (سڑکوں پر) وچند نقاط دیگر بر ضدِ حکومت کے خلاف) تظاہرات (شور و بلوہ) صورت گرفت (پیدا ہوا) پرچم شاہ بجائے مجسمہ نصب گردید۔ در میدانہا زد و خوردی رخ داد۔ تظاہرات نیم شب ادامہ داشت یعنی شورش و ہنگامہ کئی رات تک چلتا رہا۔

پارٹی کو پسپا کرنے کا حکم

اُسی روز امریکی سفیر ہنڈرسن، ڈاکٹر مصدق سے ملا۔ اس موقع پر اس نے مصدق سے یہ شکایت کی کہ ملک میں جہاں جہاں امریکن باشندے یا امریکن ادارے موجود ہیں، تودہ اور دوسری جماعتوں کے غوغائی تھ بدسلوکی سے پیش آرہے ہیں جس کی وجہ سے اُن کی زندگی ضیق میں ہے اگر جلد از جلد اس صورتِ حال کا تدارک نہیں کیا گیا تو وہ مجبور ے تمام اداروں کو بند کردے اور کل امریکن باشندوں کو ایران ترک کر دینے کا حکم دیدے۔ اگر ایران حقیقتاً امریکہ کی دوستی کا خواہاں ہے ے ایران کو فوراً اس سلسلہ میں کوئی موثر قدم اُٹھانا چاہئے ـــ کہا جاتا ہے کہ دورانِ گفتگو میں ہنڈرسن نے مصدق سے یہ بھی پوچھا فرمان کے پیشِ نظر اب ایران کا قانونی وزیر اعظم کون ہے وہ یا جنرل زاہدی ـــ ؟ ۔ یہ سوال نہ تھا بلکہ ایک چھپا ہوا اشارہ تھا اس بات کا ق نے تودوں کے متعلق اپنی پالیسی نہیں بدلی تو ممکن ہے شاہی فرمان کے مطابق امریکی حکومت مصدق کو ایران کا قانونی وزیر اعظم تسلیم کرنے الردے۔

ادھر مصدق خود بھی تودہ پارٹی کے شر اور طغیان سے خایف ہو رہا تھا۔ ایران کا کمیونزم ہو جانا اُسے ہرگز پسند نہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ خود جو ایک دار ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مزید یہ کہ اسے مالی امداد کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی ۔ ۔ حکومت کا خزانہ گویا خالی تھا ـــ امریکہ کو دشمن یا ٹانا سیاسی مصالح کے قطعاً خلاف تھا، اس لئے کہ قرض صرف اُسی ملک سے لیا جا سکتا تھا ـــ شاید مصدق نے یہ سوچا کہ وہ اپنی بازی ہے اور اب تودہ پارٹی کی احتیاج اُسے باقی نہیں رہی۔ اس جماعت کے ساتھ مزید نرم رفتاری ملک کو خطرہ میں ڈھکیل دینا ہے ۔ ۔ ۔ راد کا یہ خیال ہے کہ ان اسباب کے تحت مصدق نے ہنڈرسن کے اشارہ پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُدھر ہنڈرسن رخصت ہوا ق نے رئیس شہربانی (کوتوالی کا افسر) کو ٹیلیفون کرایا کہ وہ تودوں کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور ان کے شور و شر کو دبانے کے لئے پوری قوت ے لیکن نتیجہ نے بتلا دیا کہ یہ ایک بڑی چوک تھی جو مصدق سے سرزد ہو گئی۔ تودوں کو کچلنے کے لئے اُسے اتنا تاکیدی حکم نہیں دینا چاہئے تھا۔ آگ سے کھیلنے کا حوصلہ تودہ پارٹی ہی کے پیروؤں میں تھا۔ وہ مرنا بھی جانتے ہیں اور مارنا بھی۔ ایران کی کوئی دوسری جماعت نہ تودوں عظم ہے نہ پُرکار ـــ ایسے نازک موقع پر تودہ پارٹی کے خلاف تلوار اُٹھانے کا فیصلہ کسی طرح قرینِ مصلحت نہ تھا ـــ بعضوں کا عقیدہ دوں کے خلاف فوری اقدام کرنے کا "مشورہ" ایک خاص سازش کے تحت دیا گیا تھا جس کا نقشہ پہلے ہی سے طیار کر لیا گیا تھا اور یہ ایک تھی جو مصدق پر چل گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ طہران کی ایک بڑی جماعت کا خیال یہ ہے کہ امریکن سفارت نے مصدق کے گرانے میں بڑا اہم اور ے کھیلا ہے اور ارتجاعی گروہ کے لوگ امریکی افسروں اور دیگر موثر عناصر سے گہرا میل جول رکھتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو

اتنا مسلّم ہے کہ تودوں کو کچلنے کا حکم دے کر مصدق نے اپنے مخالفوں کی راہ سے ایک بہت بڑا خطرہ دور کر دیا ــــ !

ایک دوسری اہم چیز جس نے مصدق کے رسوخ و دبدبہ پر بُرا اثر ڈالا وہ یہ ہے :۔ اگرچہ مصدق نے وزارت جنگ کا قلمدان شاہ سے چھین لیا تھا لیکن فوج کے افراد شاہ کو ہی بدستور اپنی وفاداری اور عقیدت کا مصدر و مرکز سمجھتے رہے، کیونکہ وہ ایک عمر سے اسی سے منسلک تھے اور پرانی روایات کے احترام کا دل سے نکال پھینکنا کسی کے لئے آسان نہیں، سپاہیوں کے لئے یہ بات اور بھی مشکل ہے۔ ان روایات کا اخلاقی اثر پولیس پر بھی گہرا تھا۔ شاہ کی شخصیت ان کے لئے بھی ظل اللہ کا حکم رکھتی تھی۔ چنانچہ اب جو اس بات کی شہرت ہوئی کہ شاہ مصدق کو معزول کر کے جنرل زاہدی کو وزیر اعظم مقرر کر دیا ہے تو قدرتی طور پر فوجیوں اور سپاہیوں کے مورال (MORALE) پر اس کا اثر خراب پڑا۔ وہ دو دل ہو گئے ------ پھر ایسے عوام جو شاہ کو بھی چاہتے تھے اور مصدق کے بھی بہی خواہ تھے ان کی ہمتیں اس خبر سے سرد پڑ گئیں۔ اب شاہ مظلوم سمجھا جانے لگا تھا۔ وہی طبقہ جو تودوں کا ہمعقیدہ تو نہیں مگر مصدق کا حمایتی ضرور تھا یہ اظہار خیال کرنے لگا تھا کہ مصدق ناحق شاہ کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ شاہ تو حکومت کے معاملوں میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ شاہ کے چلے جانے سے عوام کے دل و دماغ پر گہرا اثر پڑا تھا۔ شاہ کی "بیچارگی اور کس مپرسی" نے رحم اور نرمی کے جذبات پیدا کر دئے تھے ــــ یہ ایک نہایت نازک وقت تھا اور انتہائی تدبر کی ضرورت تھی ایک ایسے موقع پر جبکہ عوام کے دل شاہ کے ساتھ تھے اور ان کے خیالات جذباتی دور سے گزر رہے تھے ان کے احساسات کو جھنجھوڑنا یا زخمی کرنا ہرگز عقل و مصلحت کی بات نہ تھی۔

جماعتی اختلافات

اس کے علاوہ تودہ پارٹی اور دوسری سیاسی جماعتوں میں شدید پھوٹ پڑ گئی۔ تودوں کا مطالبہ یہ تھا کہ شاہ تو جا چکا اب ملک کا نظام جلد از جلد جمہوری بن جانا چاہئے۔ ان کا نعرہ یہ تھا :۔ زندہ باد حکومت جمہوری دموکراتیک خلق لیکن اور تمام دوسری جماعتیں اس نظریہ کی سخت مخالف تھیں۔ انھیں اندیشہ تھا کہ اگر تودے کامیاب ہو گئے تو پھر ملک کا نظام جمہوری نہیں کمیونسٹی بن جائے گا۔ یہ اندیشہ بڑی حد تک صحیح تھا۔ تودہ جماعت جس طوفانی طریقہ پر کام کر رہی تھی اور اس کے جوش و خروش سے جس بے صبری کا اظہار ہو رہا تھا وہ اس بات کا نمایاں ثبوت تھا کہ وہ ملک میں جلد سے جلد اپنا تسلط قایم کر لینا چاہتی ہے۔ لیکن یہ اُن کی سیاست کا کچا پن تھا اور اس بات کی نمایاں دلیل کہ یا تو ان کے پاس کوئی تجربہ کار لیڈر موجود نہیں یا پھر انھیں اپنے "ہڈ کوارٹر" سے اچھی ہدایت نہیں ملی۔ اگر وہ صبر سے کام لیتے تو ایسے اہم موقع پر ایسی طفلانہ جلد بازی نہ کرتے۔ تودہ پارٹی کی جلد بازیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں اور ملک کی دوسری جماعتوں میں دھینگا مشتی شروع ہو گئی ــــ لیکن بہ حیثیت مجموعی تودوں کا زور غالب تھا۔ یہ خیابانوں کے نام کی پلیٹیں اُکھاڑ اُکھاڑ کر پھینکنے لگے اور ان کی جگہ کمیونسٹ طرز کے نام کی پلیٹیں لگائی جانے لگیں جس محلّہ کا نام "میدان شاہ" تھا، اس کا نام بدلکر "میدان تودہ" رکھا گیا۔ "میدان شاہ" کا محلہ طہران کے جنوب میں واقع ہے یہ زیادہ تر غنڈوں اور شہدوں کی بستی ہے۔ ایرانی اصطلاح میں انھیں "چاقوکشہا" "لات ہا اور لوطی ہا" کہتے ہیں۔ یہ مار دھاڑ، قتل و خونریزی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ دُنیا کے تمام جرائم پیشہ لوگوں کی طرح یہ بھی کٹر قسم کے مذہبی ہیں اور دین و ایمان کے بڑے فدائی ان کے دو لیڈر طیّب اور شعبان بے مُخ (یعنی بے مغز) خاص شہرت کے مالک ہیں۔ شعبان کو بے مُخ کا لقب اُس کے مخالفوں نے دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شعبان کے پاس صرف تن توش ہے عقل و ہوش نہیں۔ محرم اور دیگر مذہبی تہواروں کے موقعوں پر جاہل عوام اُن کے یا اُن کے دستوں کے آگے بھیڑوں اور بکریوں کی قربانی چڑھاتے ہیں[1]۔ یہ لوگ مذہبی مجنون ہونے کے علاوہ بڑے شاہ پرست بھی ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ

---

[1] ہندوستان کی طرح یہ ایران کی بھی ایک قدیم رسم ہے۔ پُرانے زمانوں میں لوگ بادشاہوں کے لئے اپنے عشق و محبت کا اظہار اپنی اولاد کی قربانی چڑھا کر کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہر طاقتور اور حکمراں شخصیت کے لئے جانوروں کی قربانی دی جانے لگی۔ سنتے ہیں ایران کے اساطیری پہلوانوں رستم اور سہراب کے قدموں پر بھی جانور ذبح کئے جاتے تھے۔

کا "دست شفقت" ہمیشہ ان پر سایہ کئے رہتا ہے۔ قدرتاً یہ گروہ "لامذہب اور شاہ دشمن" تودوں کی جان کا دشمن ہے۔ چنانچہ اب
روہ نے دیکھا کہ تودے سارے شہر پر حاوی ہوتے چلے جا رہے ہیں تو یہ کمر باندھ کر اُن سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے ـــــ لیکن چند باخبر غیر تودہ
کے بقول جن کا ادعا یہ ہے کہ وہ مصدق کے زوال کے اندرونی واقعات کا علم رکھتے ہیں اس گروہ کی آمادگی کے پیچھے بڑے بڑے "مذہبی
ی" ہاتھ کام کر رہے تھے ۔۔۔۔۔۔۔ اُن کا کہنا ہے کہ شاہ کے فرار کے بعد امریکی سفارت کے روپے طہران کے چند معروف مجتہدوں اور
ے ہاتھوں "لوطی ہا" اور شہر کے چھوٹے موٹے ملاؤں کے درمیان فیاضی کے ساتھ تقسیم کئے گئے۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ "لوطی ہا" کے
ساتھ فوج اور پولیس کے چند ممتاز افسروں کی مٹھیاں بھی خوب گرم کی گئیں ـــــ واقعات و حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان بیانات
ے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی ـــــ خلاصہ یہ کہ "لوطی ہا" کی جماعت نے تودوں اور شاہ دشمنوں سے نپٹنے کا چیلنج دیدیا ـــ ان سب
حکومت کے حکم سے اب پولیس بھی علانیہ تودوں کے خلاف تھی۔ ۱۸ر اگست کی رات تک طہران کی مشہور سڑکوں پر تودے، لوطی ہا اور
سیاسی جماعتوں کے درمیان لڑائی جاری ہے۔ پولیس نے اس موقع سے فایدہ اُٹھا کر امن و امان قایم رکھنے کے پردہ میں تودوں کو
سے پیٹنا شروع کیا۔ اسی دوران میں کسی نامعلوم گوشہ سے شہر میں یہ بات پھیلا دی گئی کہ مصدق نے شاہ کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں
پلانے کا حکم دیدیا ہے۔ چونکہ یہ تشخیص مشکل تھی کہ کون تودہ پارٹی کا پیرو ہے اور کون نہیں اس لئے پولیس والے جو فاطمی کی زیادتیاں اور
کی تباہ کاریاں دیکھ دیکھ کر اندر نفرت سے اُبل رہے تھے نیز مصدق کی معزولی کی خبر سُن کر دلیر بن گئے تھے اب ہر اُس شخص کو مارنے اور گرانے
ش و خروش کا مظاہرہ کرتا یا شاہ کے خلاف نعرے لگاتا ـــ یہ بلوائیوں پر رائفلیں چلاتے اور ساتھ ہی ساتھ "برقرار باد سلطنت
حزب تودہ" کے نعرے لگاتے ـــ تودوں نے جو یہ دیکھا کہ مصدق کے حکم سے پولیس والے ہاتھ دھو کر اُن کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور
لی والے بھی دشمنی پر کمر بستہ ہیں تو انھوں نے مصدق کی محبت پر دو اسوخت پڑھا اور شاید مصدق کو "اُس کی غداری" کا مزہ چکھانے
فیصلہ کر لیا کہ اب اگر پھر کبھی مصدق کی حکومت اگلے دنوں کی طرح خطرہ میں پڑی اور ملک میں اُس کے خلاف بلوہ و فساد برپا ہوا
ت اُس کا ساتھ نہیں دیں گے۔

رق کا سقوط۔ شاہ پسندوں کی جیت

۱۹ر اگست کا آفتاب ابھی اچھی طرح گرم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ بقول ایک مقامی اخبار کے "عدۂ زیادی از لوطی ہا و مردم پابرہنہ و لباس پارہ از "میدان شاہ"
ردند"۔ یعنی لوطی ہا اور ننگے پاؤں، پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے لوگوں کے گروہ میدان شاہ سے نکلے۔ یہ لوگ ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے
بادشاہ"۔ "مردہ باد خائنین وطن" کے نعرے لگاتے ہوئے ایرانی مجلس کی عمارت کے سامنے آپہونچے۔ شروع شروع میں تو ان کی تعداد
دہ نہ تھی لیکن جوں جوں دن چڑھتا گیا ان کے غول میں اضافہ ہوتا گیا ـــ لوگوں کو حیرت تھی کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ ابھی کل تک شہر کی سڑکیں
بازار "مرگ بر شاہِ فراری" "برچیدہ باد سلطنت" کے نعروں سے گونج رہے تھے اور آج یہ انقلاب کہ شاہ دوستوں کے دستے "زندہ باد
کے نعرے لگا رہے ہیں اور کوئی مزاحم نہیں ہوتا۔ آنے جانے والے کاروباری افراد یہ اور ایک دوسرے سے تعجب کا اظہار کرتے۔ سب سے
چنبھے کی بات یہ تھی کہ سڑکوں اور چوراہوں پر پولیس والے اپنے ڈنڈے لٹکائے ظاہرا بے توجہی کے ساتھ مظاہرے کرنے والوں کی نقل و حرکت
کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ مظاہرے اور بڑھنے لگے۔ اب شہر کے اُن خیابانوں سے بھی دو چار لاریاں "شاہ فیروز است" کے نعرے لگاتی
رنے لگیں جہاں صبح کے دس گیارہ بجے تک اس قسم کا کوئی شور و غوغا سننے میں نہیں آیا تھا۔ پولیس والے ان خیابانوں میں بھی ان مناظر کے
تماشائی تھے۔ سارا طہران حیرت کا مجسمہ بنا ہوا تھا کہ یہ کیا انقلاب ہے۔ اب نہ "مرگ بر شاہ" کی صدائیں سننے میں آتی ہیں نہ "برچیدہ
سلطنت" کے دہشتناک نعرے آسمان سے ٹکرا رہے ہیں، لمحہ بہ لمحہ کوچہ و بازار کا رنگ کچھ سے کچھ ہوتا جا رہا تھا۔ دوکاندار جلد جلد اپنی دوکانیں رھا
تے۔ مائیں اور مامائیں بچوں کو سمیٹے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو بھاگی جا رہی تھیں۔ بزاز و بساطی اپنی بساطیں سمیٹ رہے تھے۔ راہگیروں کی
تیزی کے ساتھ چھٹتی جا رہی تھی کچھ ایسا ہی شور و شر کا عالم تھا کہ گیارہ بجے کے قریب خبر سارے شہر میں دوڑ گئی کہ شاہ پرستوں نے ڈاکٹر

حسین فاطمی کے اخبار "باختر امروز" کے دفتر کو جلا کر خاکستر کر ڈالا۔ پھر پے در پے یہ خبر اڑنے لگی کہ دیگر انقلابی جماعتوں کے دفاتر اور اخبارات کے آفس بھی پھونک ڈالے گئے۔ اب کچھ کچھ پولیس والے بھی رائلسٹ دستوں کے ساتھ نظر آرہے تھے۔ چند پرجوش مصدق کے حمایتی پولیس پر حملہ آور ہوئے اور اُن کی رائفلیں چھیننے لگے۔ اس پر گولیاں چلنی شروع ہوگئیں۔ حکومت کے طرفداروں کی ہوا ہر طرف اُکھڑتی جارہی تھی۔ کچھ لوگ شاہ کے ٹوٹے ہوئے مجسموں پر شاہ کی تصویریں لٹکا رہے تھے۔ کوئی دو بجے تک شہر کے شاہراہوں پر ہنگامے جاری تھے جس کی ہدایت باغی فوج اور شاہی گارڈ کے افسر کر رہے تھے۔ ایک اخبار کا بیان ہے:۔ "درمیان تظاہر کنندگان نیز گاہ بگاہ اشخاص کہ لباس نظامی (فوجی) در تن داشتند یا بہ لباس مبدل در آمدہ بودند دیدہ می شدند" یعنی بعض فوجی بھی لباس بدل کر بلوائیوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ رائلسٹ گروہ ہر طرف "زندہ باد شاہ" کے نعرے تو لگاتے پھر رہے تھے مگر "مردہ باد مصدق" کی صدا کسی کی زبان پر نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دن کے تین بجے تک شاہ دوستوں کی جماعتیں اور ہر طرح کے نعرے لگاتی پھر رہی تھیں، مگر مصدق کے خلاف ایک حرف بھی سننے میں نہیں آرہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ کے طرفداروں نے خاص طور پر یہ التزام کر رکھا تھا کہ مصدق کی شخصیت کے خلاف کچھ نہ کہا جائے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ ان کا بڑا ہی عاقلانہ فعل تھا۔ حسین فاطمی نے شاہ کی شان میں بدکلامیاں کیں تو قوم کے جذبات بھڑک اٹھے اگر مصدق کے خلاف یہی غلطی رائلسٹ کرتے تو اس کا قوی امکان تھا کہ عوام میں اشتعال پیدا ہوجاتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اُن کی جیت خطرہ میں پڑ جاتی اس واقعہ کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اسّی فیصدی عوام کو صحیح طور پر پتہ نہ تھا کہ یہ شور و ہنگامہ کیوں ہو رہا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے — عوام کیا خود وزراء کابینہ کو بھی اس کا علم نہ تھا کہ پانچ چھ گھنٹوں کے بعد ان کی حکومت کا خاتمہ ہوجانا ہے۔ مصدق اور اس کے ساتھی اس کے مشیران خصوصی اپنی اپنی جگہ مطمئن بیٹھے تھے کہ کوئی مصدق کی حکومت کا پایہ بھی نہیں ہلا سکتا، اُس کو درہم برہم کر دینا تو خیر بڑی بات ہے۔ باہر طوفان زور پکڑ رہا تھا اور مصدق کے گھر پر فاطمی اور نہضت ملی پارٹی کے دوسرے لیڈر بظاہر ان آندھیوں سے بے پروا، باہم یہ مشورہ کر رہے تھے کہ ملک کو جمہوری بنانے کے سلسلہ میں دوسری رائے شماری کے لئے کیا مناسب اقدامات کئے جائیں۔

دن کے دو بجے کے بعد ہر طرف سے بلوائیوں کا اژدہام مختلف دستوں کی شکل میں شہربانی (کوتوالی) ریڈیو، پبلیسٹی کے ادارے اور وزارت خارجہ کی طرف بڑھنے لگا۔۔ وزارت خارجہ کی عمارت کے پاس بلوائیوں کا گروہ فاطمی کے خلاف نعرے لگانے لگا۔ اتنے میں خبر آئی کہ رائلسٹ دستوں نے بغیر کسی بڑی جدوجہد کے شہربانی (کوتوالی) کی عمارت پر قبضہ کر لیا۔ ان دستوں نے شاہی گارڈ کے اُن سپاہیوں کو آزاد کرایا جنھیں "کودتا" کی رات مصدق کے گھر کا محاصرہ کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ چونکہ ان فوجیوں پر دیگر سختیوں کے علاوہ بھوک کی مار بھی پڑی تھی یہ بپھرے ہوئے شیروں کی طرح بلوائیوں کے ساتھ ہوگئے۔ کوئی تین بجے کے قریب پبلیسٹی ادارہ پر قبضہ ہوگیا۔ وہاں شاہ کی تصویر لٹکائی گئی رائلسٹوں کے دوسرے دستوں نے ریڈیو پر تسلط حاصل کر لیا۔ منظر اس قدر جلد جلد بدل رہا تھا کہ کسی چیز کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا۔ ملک کا انتظام مچھلی کی طرح حکومت کے ہاتھ سے پھسلتا جا رہا تھا ---------- اوپر کہیں یہ کہا جا چکا ہے کہ ایران میں حکومت اُسی کی ہے جس کے ہاتھ میں ریڈیو کے ادارہ کا کنٹرول ہے۔ چنانچہ طہران ریڈیو کا رائلسٹوں کے ہاتھوں میں آنا تھا کہ سارے شہر میں شاہ دوستوں کی فیروزمندی کا ڈنکا پیٹ دیا گیا۔ ہر لمحہ اب ریڈیو سے یہ پیغام نشر ہو رہا تھا کہ "بہمتِ مردمان شاہ دوست و پشتیبانی ارتش (فوج) شاہ دوست طہران تصرف شد۔ (یعنی شاہ دوستوں کی ہمت اور رائلسٹ فوجیوں کی حمایت سے طہران فتح ہوگیا)۔ حکومت مصدق ساقط گردید (مصدق کی حکومت گرا دی گئی) حالا مردم پایتخت ہمہ در انتظار بازگشت شاہ ہستند۔ (اب تمام لوگ شاہ کی واپسی کے انتظار میں ہیں) — پھر ریڈیو سے یہ صدا بلند ہوئی کہ ستادِ ارتش (فوجی محکمہ) بدست "مردم"[1] افتاد و افسران و سربازان (سپاہی)

---

[1] یہاں مردم (یعنی عوام) کے لفظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ جو طاقت بھی برسر اقتدار آتی ہے وہ عوام ہی کا سہارا لیتی ہے۔ پروپیگنڈہ کو موثر بنانے کے لئے ایسا ہی کہا جاتا ہے۔ یہاں مردم کی جگہ رائلسٹ کا گروہ سمجھنا چاہئے اس لئے کہ عام لوگوں کا اس معاملہ میں کوئی ہاتھ نہ تھا۔

نا دوش (ساتھ ساتھ) مردم ہستند۔ یعنی فوجی محکمہ بھی "لوگوں" کے قبضہ میں آگیا اور فوج کے افسر اور سپاہی بھی "عوام" کے شانہ بہ
کام کر رہے ہیں ... پھر کچھ لمحوں کے بعد کسی نے بھرائی ہوئی آواز سے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا کہ — مردم نگذارید کہ مصدق و طرفداران او
ست شما فرار کنند۔ شعارِ (نعرہ) شما زندہ و پایندہ بادشاہ باشد — عوام، فاطمی را تکہ تکہ (ٹکڑے ٹکڑے) کردند۔ روزنامہ ہائے حکومتی
ش زدند ..... ابھی ریڈیو اسٹیشن سے اس طرح کے پیغامات نشر ہو ہی رہے تھے کہ اعلان کیا گیا — سرلشکر (جنرل) زاہدی
ت وزیر (وزیر اعظم) برائی ابلاغِ پیام اعلیحضرت بہ مردم بہ استودیو آمدہ اند۔ یعنی وزیر اعظم زاہدی عوام کو شاہ کا پیام سنانے کے
یڈیو کے اسٹوڈیو میں آگئے ہیں، جنرل زاہدی نے قوم کے نام یوں نشر کیا:۔ "بنام خداوند قادر مستعال۔ ملت رشید و ہموطنان عزیزم
ب امر اعلیحضرت ہمایوں شاہنشاہی سمت نخست وزیری را پذیرفتہ ام و در قبول ایں خدمت بعد از اُمید بخداوند بہ نیروئی شما متکی ہستم
تہائی گزشتہ خیلی بہ شما وعدہ دادند ولی امیدوارم برخلاف آنہا بہ وعدہ ہائے خود وفا نیم"۔ یعنی پیارے ہموطنوں شاہ کے
سے میں نے وزیر اعظم کا عہدہ قبول کر لیا ہے۔ اس خدمت کے قبول کرنے میں خدا کے بعد میرا اتکان آپ کی قوت پر ہے۔ اگلی حکومتوں
پ سے بڑے بڑے وعدہ کئے لیکن ان کے برخلاف میری اُمید یہ ہے کہ میں اپنے وعدوں کو پورا کروں گا"۔ اس کے بعد زاہدی نے
اقتصادی پروگرام پڑھ کر سنایا کہ وہ ملک کی خوشحالی اور بہبودی کے لئے کیا کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد پرنس عبدالرضا نے ریڈیو سے
لی "شاہ دوستی" کا شکریہ ادا کیا:۔ "از احساساتِ پاک و وطن پرستانۂ شما تشکر میکنم۔ زندہ باد اعلیحضرت محمد رضا شاہ پہلوی"۔
ر ریڈیو سے تو یہ بیانات نشر کئے جا رہے تھے اُدھر مصدق کے مکان کا گرد و پیش میدان کارزار بنا ہوا۔

صدق کے مکان کی تباہی

اخبار کیہان کا بیان ہے کہ ستائیس ٹینک ہر چہار طرف سے اُس محلہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھے، جہاں مصدق کا مکان تھا۔ کوئی ساڑھے چار بجے کے بعد سے حملہ آوروں اور مصدق کے مسلح
ظوں کے درمیان شدت کے ساتھ گولیاں چلنا شروع ہوئیں۔ بلوائیوں کی بھیڑ جوق در جوق ٹینکوں اور فوجی لاریوں کے پیچھے پیچھے
د و غل مچا رہی تھی۔ اردگرد کے مکانات گولہ باری کے اثر سے لرز رہے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹہ یا پینتالیس منٹ تک فریقین جم کر لڑے۔
بجے کے بعد مصدق کے گھر کے مسلح محافظ گولیوں کے ختم ہو جانے کے سبب، ایک ایک گرنے لگے۔ مکان کے آہنی دروازہ کے سامنے خون
یل جاری تھی۔ ابھی دونوں طرف سے گولیاں چل ہی رہی تھیں کہ اتنے میں ایک پہاڑ جیسا ٹینک مصدق کے مکان کے لوہے کے پھاٹک
مضبوطی کے ساتھ بند کر رکھا گیا تھا، کڑکڑاتا، پیستا ہوا اندر گھس گیا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر جنگ اور جاری رہی۔ بالآخر محافظوں
تھیار ڈال دئے ..... مصدق اور اس کے چند مشیرانِ خاص گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ قبل کسی نامعلوم دروازہ سے فرار کر چکے تھے ....
ین فاطمی جو صبح سے مصدق کے مکان پر موجود تھا، وہ بھی بھاگ نکلا ..... گولہ باری کا بند ہونا تھا کہ وہ ساری خلقت جو وہاں
تھی مکان کے اندر داخل ہو گئی ..... پھر تو وہ لُٹس پڑی کہ اللہ کی پناہ۔ مشہور مقامی روزانہ اخبار کیہان لکھتا ہے کہ:—
رکس ہر چہ بدست میامد میبرد"۔ یعنی جس کے پلّے جو پڑتا وہ لیکر بھاگتا — ایک دوسرا صبح کا اخبار داد کا بیان ہے:۔ "کلیہ اثاثیہ و
زم خانہ مصدق در چشم زدن از میان رفت و بیشتر خانہ با خاک یکساں بود"۔ یعنی پل مارتے مصدق کے مکان کا سارا سامان لوٹ لیا گیا
گھر کا بڑا حصہ خاک میں ملا دیا گیا — جو لوگ اس غارتگری کے چشم دید گواہ ہیں ان کا بیان ہے کہ لوٹنے والے کپڑوں کی کھونٹیاں، پرانے جوتے
تک کہ غسلخانہ کی کھڑاؤں تک اُٹھا کر لے گئے — !! ایک معروف ہفتہ وار مجلہ "طہران مصور" لکھتا ہے:۔ "پس (یعنی لوٹ مار
بعد) خانہ را آتش زدند بطوریکہ کوچکترین اثری از اشیاء و اثاثۂ خانۂ مصدق باقی نماند و ہمگی از بین رفت"۔ یعنی مکان میں آگ لگا دی گئی
کہ مصدق کے گھر کی کوئی چیز ہی باقی نہ بچی اور تمام سامان جل کر بھسم ہو گیا۔ رات کے پچھلے پہر تک سلگتے ہوئے ملبوں سے دھواں اُٹھتا
۔ دوسری صبح جب مصدق کے مکان کی طرف سے گزرنے کا موقع ملا تو دیکھا کہ مصدق کے مکان کے سامنے اور بغل کی دیواروں پر خونی
یوں سے یہ جملہ لکھے ہوئے ہیں — "مرگ بر مصدقِ خائن و دیوانہ"..... زندہ باد شاہ — ملتِ ایرانیم، ما شاہ میخواہیم"۔ یہ دیکھ کر

بے ساختہ خاقانی کی مشہور نظم کے یہ اشعار زبان پر جاری ہو گئے ؎

ہاں اے دل عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں، ایوان مدائن را آئینۂ عبرت خواں
گویند کہ تو از خاکی ما خاک تو نیم اکنوں گامی دو سہ بر ما نہ اشکی دو سرہم بفشاں
گفتی کہ کجا رفتند آں تاجوران اینک زایشاں شکم خاک است آبستن جاویداں

۱۹ اگست ایران کی تاریخ جدید میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ آج کے دن ایران کی چھ ہزار سالہ شخصی نظام حکومت کو اُٹھا پھینکنے کی پہلی کوشش ناکام رہی۔ لیکن کیا دوسری اور تیسری کوششیں بھی اسی طرح ناکام رہیں گی — ؟ - بڑے سے بڑا پیغمبر بھی اس سوال کا جواب قطعی نفی میں دینے کی جرائت نہیں کر سکتا — مصدق ضرور گرا دیا گیا — لیکن کیا مصدقیت بھی گرا دی گئی — ؟ نہیں — وہ ایرانی خون میں گھل مل چکی ہے — قومیت کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے — آج ایران کا ہر جدید الخیال نوجوان تاج و تخت کو ایک فروعی اور فضول سی چیز سمجھنے لگا ہے۔ اُس کے فکر و ذہن کا سانچہ کچھ اس طرح کا ڈھل رہا ہے کہ اب وہ "جمشید و کیخسرو" کے شاہانہ نظام کو وقت کے مطالبات سے ہم آہنگ نہیں پاتا ایران میں انقلابی خیالات کی آندھیاں چلنے لگی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے حباب بھی اب منہ سے طوفان اُگلنے لگے ہیں۔ موجیں بیقرار ہیں — اگر امراء و سرمایہ داروں کا رویہ وہی رہا جو ہے ۔۔۔۔۔ اگر اقتصادی نابرابری اور مظالم کی ہوا یوں ہی چلتی رہی جس طرح چل رہی ہے ۔۔۔۔۔ تو ۔۔۔۔۔ البرز اور دماوند پہاڑوں کے نیچے جو گرم اور خونی مواد کھول رہا ہے اُس کا پھٹ پڑنا یقینی ہے ؎

فریبِ جہاں قصۂ روشن است بہ بیں تا چہ زاید شب آبستن است!

اب مصدق پر "بغاوت اور خودسری" کا مقدمہ چلایا جا رہا ہے اُسے دیوانہ و خائن کہا جا رہا ہے۔ بعضوں کا خیال ہے مصدق ساحر تھا اس نے ساری ملت پر سحر کر رکھا تھا۔ ریڈیو اور اخباروں میں کہا جا رہا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ ملک و قوم ایک بہت بڑے تہلکہ اور خطرہ سے باہر نکل آئی۔ نوجوانوں کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہم پھر اس طرح کے فریب اور گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ "از گزشتہ ہائے شوم و ملامت انگیز عبرت گرفتہ اسیر نیرنگ اینہا نشوید۔" لیکن اس نیرنگ کو آج نہیں تو کل پھر رونما ہونا ہے اور اگر ایران میں ایک مصدق کو کامیابی نہیں ہوئی تو کوئی دوسرا مصدق اس مقصد کو پورا کر کے رہے گا۔

"ایران دوست"

فرمانروایان اسلام نمبر

کے لئے

چھ آنے مصارف رجسٹری کے لئے ضرور روانہ فرمائے اگر آپ کی خریداری دسمبر ۵۳ء میں ختم نہیں ہو رہی اور اگر خریداری دسمبر ۵۳ء میں ختم ہو رہی ہے اور چندہ ذریعہ منی آرڈر روانہ کرنا چاہتے ہیں تو آٹھ روپیہ چھ آنے بھیجئے۔ گم ہو جانے کی صورت میں یہ سالنامہ مکرر مفت روانہ نہ ہوگا۔

"منیجر"

آوارہ گرد اشعار

(۷)

بہ سلسلۂ ماہ دسمبر ۵۲ء

نمبر ۱ - دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار — جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے

رسالہ آج کل بابت مارچ ۵۳ء میں اسلام حسین صاحب نے یہ شعر ریاض خیرآبادی کے نام لکھ کر ایک بہت بڑی عمارت کھڑی کر دی ہے کہ یہ شعر ریاض کے مخصوص رنگ کی بڑی لطیف مثال ہے اور احساسات کی نزاکت اور انداز بیان کی شیرینی سے معمور ہے ... کتنی اچھوتی تشبیہ اور دلکش پیرایہ ہے یہی وہ انفرادیت ہے جس نے ریاض کی شاعری پر ایک ابدی تازگی اور شگفتگی کی روح پیدا کرتی ہے ... لیکن مضمون نگار کو معلوم نہیں یہ شعر ریاض کا نہیں بلکہ شاد کا مشہور شعر ہے، اگر اسی شعر پر ریاض کی انفرادیت اور شگفتگی کا دار و مدار ہے، تو ساری عمارت درہم برہم ہو جاتی ہے۔

نمبر ۲ - میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر — دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

یہ شاد کا مشہور و معروف شعر ہے مگر ماہ نو کے ستمبر ۴۹ء میں صفحہ ۳۲ پر یہ شعر جلیل سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ مضمون نگار ڈاکٹر یوسف حسن مصنف تغزل کو غالباً سہو ہوا ہے۔ عرصہ ہوا لاہور کے کسی رسالہ کے سالانہ نمبر میں شاد کی ایک پوری غزل "اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا" جلیل کے نام سے شایع کر دی گئی تھی اور لطف یہ ہے کہ جلیل کا مقطع بھی اس میں شامل کر دیا تھا" معلوم نہیں یہ کس شخص کی ذہانت کا نتیجہ تھا۔

نمبر ۳ - شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

کون نہیں جانتا کہ یہ شعر میر تقی کا ہے مگر صاحب گلِ رعنا نے یہ شعر بادنیٰ تغیر مصحفی سے منسوب کیا ہے۔ مصحفی کے آٹھویں مصحف (دیوان) کی ورق گردانی کی جائے پتہ چلے کہ یہ شعر ان کے دیوان میں داخل ہے یا نہیں۔

نمبر ۴ - ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا — دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

یہ شعر مولانا وحید الہ آبادی کا ہے مگر اردو غزل کے مصنف ڈاکٹر یوسف حسن نے اس شعر کو اپنی کتاب کے صفحہ ۶۱۰ میں ریاض کے اشعار کے ذیل لکھا ہے اور لفظ "ہم نے" کی جگہ "پہلے" لکھا ہے۔ یہ شعر ریاض کا نہیں بلا اختلاف وحید ہی کا ہے۔

نمبر ۵ - چرخ کوکب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں — کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

ڈاکٹر یوسف حسن نے یہ شعر اردو غزل کے صفحہ ۲۴۹ میں صبا لکھنوی سے منسوب کیا ہے جس سے بہ ظاہر میر وزیر علی صبا شاگرد آتش مراد ہیں دوسرے تذکروں میں یہ شعر منولال صبا کا ہے جو مصحفی کے شاگرد تھے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لالہ کانجی مل صبا کو اپنا شاگرد بتایا۔ ڈاکٹر مختار الدین آرزو، صبا کو صفا لکھتے ہیں۔ (نگار نومبر ۳۹ء) بعضوں نے انھیں میر تقی کا شاگرد بتایا ہے اور اس شعر کو حسرت سے بھی منسوب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بعضوں نے اسے غالباً میر سے بھی منسوب کیا ہے گرچہ میر کے دیوان میں موجود نہیں۔ صفا ایک مجہول الاسم شاعر کا ایک شاگرد ابراہیم الدین اور شیفتہ نے یہ لکھا ہے ؎

محبت جھوٹ ہے مے کس نے بھری شیشہ میں — رہ گئی ہے مرے آنسو کی تری شیشہ میں

نمبر ۶ - تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں — موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں

ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے نگار بابت نومبر ۳۹ء میں منور خاں غافل کے حسب ذیل شعر پر نوٹ دیکر لکھا ہے کہ اس مضمون کا شعر غالب نے بھی لکھا ہے۔ غافل کا شعر یہ ہے :-

صدمۂ ہجر مری جان اٹھانے کی نہیں — تو نہ آوے گا تو کیا موت بھی آنے کی نہیں

"آ بھی نہ سکوں"۔ "بلا بھی نہ سکوں" کی زمین میں غالب کے صرف تین اشعار پائے جاتے ہیں، غالباً طرز بیان کی بنا پر اسے بھی غالب سے منسوب کر دیا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو یہ شعر غالباً شادانی صاحب کی تصنیف ہے گرچہ ان کی "نشاط رفتہ" میں نہیں ہے بہرکیف غافل کے مضمون پر داغ کا ایک تیکھا شعر سنئے:۔

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی　　کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

نمبر ۷ ۔ جھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا　　صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

یہ شعر بہت مشہور ہے اور اکثر لوگوں نے اس کو میر سے منسوب کیا ہے۔ اس زمین میں میر کی غزل ضرور ہے مگر یہ مطلع نہیں۔ کسی مضمون میں اثر صاحب نے بھی میر ہی سے منسوب کیا ہے۔ صالحہ عابد حسین صاحبہ کا مضمون بہ عنوان "شاعری" (آج کل یکم مئی ۴۰ء) نظر سے گزرا انھوں نے بھی ضمناً یہ شعر میر ہی کے اشعار کے ساتھ لکھا ہے۔ انداز بیان بھی میر سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ مگر ایک دوسرے مضمون بعنوان "آغا حجو شرف کی شاعری" (آج کل ۱۵ جون ۴۵ء) میں یہ شعر آغا شرف سے منسوب کیا گیا ہے۔ مضمون نگار سید ذکی رضا نے آغا حجو شرف کے درمند دل اور مصائب کا حال بیان کر کے بتایا ہے کہ جب یہ رنگ زیادہ گہرا ہوتا ہے تو ان کے اشعار میں میر کا رنگ جھلکنے لگتا ہے اور یہی متذکرۂ بالا مطلع۔ ادنیٰ تغیر نقل کیا ہے۔ "جھٹپٹا وقت" کی جگہ "شام کا وقت" لکھا ہے جو بے کیف ہے۔ جھٹپٹا کا لفظ بہت بلیغ ہے شام کا لفظ تو دوسرے مصرعے موجود ہی۔ اس کی تکرار فضول ہے۔

نمبر ۸ ۔ برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے　　ہم نے اس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ہے

یہ شعر حسرت موہانی کا ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ اردو غزل کے مصنف ڈاکٹر یوسف حسن نے اسے مصحفی سے منسوب کر کے استعارہ بالکنایہ کی ٹکڑی ہوئی شکل اس شعر میں پائی ہے (اردو غزل صفحہ ۱۱۱) اور طرہ یہ ہے کہ حسرت کے منتخب کلام میں اس زمین کے اور شعر دئے ہیں مگر یہ شعر میں بلکہ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مصحفی کے منتخب کلام کے ضمن میں صفحہ ۴۸۳ پر یہ شعر مصحفی ہی کے نام سے درج کیا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس شعر کو مصحفی ہی کا سمجھتے ہیں۔

نمبر ۹ ۔ ہم نکالیں گے سن لے موج ہوا بل تیرا　　اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے

یہ شعر مومن کا ہے مگر مصنف اردو غزل کو اصرار ہے کہ یہ شعر غالب کا ہے اور غالب اور میر کے متحدہ مضمون کے اشعار کے تحت میں اس کو غالب ہی سے منسوب کیا ہے اور میر کے اس شعر سے اس کا موازنہ کیا ہے ؎

آوے گی اک بلا ترے سر سن لے اے صبا　　زلف سیہ کا اسکے اگر تار جائے گا　　ص ۲۹۱

نمبر ۱۰ ۔ گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے　　موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

یہ شعر زبان زد ہے۔ اس کی شانِ نزول یہ بتائی جاتی ہے کہ جب نصیر لکھنؤ گئے تو آتش نے پہلا مصرعہ کہا اور دوسرے مصرعہ کی فرمائش نصیر سے کی۔ نصیر نے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ چسپاں کر دیا (اورینٹل کالج میگزین فروری ۴۳ء) "اردو غزل" صفحہ ۳۷، اور پھر انتخاب کلام صفحہ ۵۲۱ پر مصنف نے اس شعر کو آتش سے منسوب کیا ہے۔ دیوان آتش میں یہ شعر نہیں ملتا اگر وہ روایت صحیح بھی ہو تو آتش زیادہ سے زیادہ ایک مصرعہ کے مصنف ہو سکتے ہیں یہ شعر محض ایک نجی صحبت کی گرم گفتاری کا نتیجہ ہے۔ آتش سے منسوب کرنے کی کوئی وجہ معقول نظر نہیں آتی جبکہ خود انھوں نے اپنے دیوان میں اس کو شامل نہیں کیا۔ آتش کا پہلا دیوان ان کی زندگی ہی میں ۱۲۶۱ھ میں شائع ہو چکا تھا۔

نمبر ۱۱ ۔ وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں　　اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

یہ شعر سودا کا ہے مگر اردو غزل کے مصنف نے صفحہ ۴۴۲ میں سودا کے نام اور پھر صفحہ ۴۵۹ میں سوز کے نام بادنیٰ تصرف (وے صورتیں نہ جانے) منسوب کیا ہے۔ میر حسن نے اس شعر کو شیدا سے منسوب کر دیا ہے ——— نمبر ۱۲ — کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ　　یہ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

اردو غزل کے مصنف نے صفحہ ۴۴۳ پر سودا کے نام اور پھر صفحہ ۴۶۰ پر قائم کے نام لکھا ہے۔ یہ شعر قائم ہی کا ہے سودا کے دیوان میں نہیں ۔ (پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی

سوویٹ حکومت کی علمی و ذہنی ترقیاں

اے۔کے۔گوپالن ممبر پارلیمنٹ نے حال ہی میں روس کا دورہ کرکے وہاں کے حالات قلمبند کئے ہیں جو بالاقساط نیشنل ہیرالڈ میں شایع ہو رہے ہیں۔ گوپالن کے یہ مذاکرات بڑے دلچسپ ہیں اور اسی حد تک ہندوستانی حکومت کے لئے باعثِ درس و اعتبار۔ آج کی صحبت میں ہم صرف اس حصہ کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو بچوں کی تعلیم و تربیت اور مذہب سے متعلق ہے۔

...کی تعلیم وہ لکھتے ہیں کہ:۔ سوویٹ روس کے تمام شہروں، قصبوں اور گاؤں میں تم کو جتنے چھوٹے بچے (لڑکے اور لڑکیاں) نظر آئیں گے وہ سب ایک قسم کی وردی میں ہوں گے۔ گلے میں سرخ ٹائیاں اور بازو پر سرخ بلے۔ ان بچوں کو "پانیر" دم قوم کہتے ہیں:۔

ان بچوں کی تعلیم تربیت کے لئے وہاں بڑے بڑے محل تعمیر کئے گئے ہیں، جن میں سے ایک بہت بڑا محل لینن گراڈ میں بھی ہے۔ انقلاب اس عمارت کا نام "قصرِ انی چیکوف" تھا جہاں زار کے مقرب امراء لہو و لعب میں اپنا وقت صرف کیا کرتے تھے۔ انقلاب کے ...نیر محل" ہو گیا۔

لینن گراڈ کا یہ محل بڑی شاندار و آراستہ عمارت ہے۔ اس کے فرش مرمر و بلور کے ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ خاک کا ایک ذرہ کہیں نظر آئے ...کنگی کا کو سوں پتہ نہیں، اس کی میزیں، کرسیاں، سوفے سب نہایت خوبصورت کٹاؤ کے کام کے ہیں۔ اس میں ۳۲۷ کمرے ہیں، ...کڑوں بچے ہر وقت نظر آتے ہیں۔

کھیل، مطالعہ، اور کتابوں کے لئے الگ الگ بڑے وسیع کمرے بنے ہوئے ہیں، جو صرف بچوں کے لئے وقف ہیں اور بڑی عمر کے صرف ...یہاں آسکتے ہیں جو ان بچوں کو مختلف فنون کی تعلیم دیتے ہیں۔

یہاں سب سے پہلے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ بچے کا طبعی رجحان کیا ہے اور اسی رجحان کے لحاظ سے اس کو تعلیم دی جاتی ہے، چنانچہ آپ ...گے کہ یہاں کوئی بچہ گا رہا ہے، کوئی رقص کر رہا ہے، کوئی نقاشی میں مصروف ہے، کوئی سائنسی تجربہ کر رہا ہے، کوئی پودے لگا رہا ہے اور ...مطالعہ میں مصروف ہے۔

یہاں بطور نمونہ ایک سچ مچ کی ریل بھی ہے، انجن اور گاڑیوں سمیت جسے بچے چلاتے ہیں۔ یہاں ایک جھیل بھی ہے جہاں بادبانی و دخانی ...اور بچے انھیں چلاتے ہیں۔ یہاں مشینوں کے پرزے بنانے، فرنیچر طیار کرنے اور مختلف اشیاء کے ڈھانچے بنانے کے بھی کمرے ہیں ...ایک کمرا کہانیاں سنانے کا بھی ہے، جہاں کی خاموش فضا اور ہلکی روشنی میں بچوں کو کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔

...اس ادارہ کے رکھ رکھاؤ پر ۵ لاکھ ڈالر سالانہ صرف کرتی ہے۔ روس میں اس قسم کے قصور و محلات سیکڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ...ہاں انھیں خالص اشتراکیت اور خدمتِ وطن کی تعلیم دی جاتی ہے اور سرمایہ داری کی انھیں ہوا بھی نہیں لگتی۔

روس میں اس قسم کے محل ہر بڑے قصبہ، ہر کارخانے اور ہر فارم میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں بچوں کی تعلیم و تفریح کا سارا انتظام کیا

جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ملک کی بہترین سرکاری عمارتیں اور باغات و میدان سب بچوں کے لئے وقف ہوتے ہیں، جہاں وہ آزادی سے گاتے، ناچتے اور کھیلتے کودتے ہیں۔

میں نے لینن گراڈ اور تاشقند کے ان محلوں کو دیکھا تو حیران رہ گیا کہ بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان میں ڈسپلن پیدا کرنے کے لئے کتنا اہتمام کیا جاتا ہے اور یہاں کے اساتذہ کس خلوص و محنت سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔

تاشقند کا محل انقلاب سے قبل رومانوف خاندان کے قبضہ میں تھا، لیکن انقلاب کے بعد حکومت نے اسے بچوں کے سپرد کر دیا جہاں ۳۸۰ بچے مختلف علوم و فنون کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

سائنس روس میں سائنس وہاں کی آبادی کا جزو زندگی ہے۔ یہاں کے سائنس داں بند کمروں میں بیٹھ کر کام نہیں کرتے بلکہ ان کے ساتھ ایک پوری جماعت کام کرنے والوں کی ہوتی ہے جو ان کے ساتھ تحقیق و جستجو میں مصروف نظر آتی ہے۔

روس کے ماہرین ریاضی و فلکیات اور عملی سائنس پر کام کرنے والے دنیا میں سب سے بہتر تسلیم کئے جاتے ہیں اور رات دن ملک و قوم کی ترقی کے لئے علمی و عملی پروگرام بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ تعمیری کاموں اور منصوبہ بندیوں کے محکموں میں بھی ایک جماعت سائنسدانوں کی موجود رہتی ہے۔ چنانچہ ماسکو کے ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں جو پانی کی قوت سے بجلی پیدا کرنے کا کام کر رہا ہے، ۱۳ بڑی بڑی تجربہ گاہیں قایم کی گئی ہیں۔

لیٹویا میں اس بات پر غور ہو رہا ہے کہ پانی کو سڑنے اور دھاتوں کو زنگ لگنے سے کیونکر بچایا جا سکتا ہے۔ بلوروسیا میں یہ تحقیق ہو رہی ہے کہ میکانکی طریقہ سے بحری جہاز رانی میں ترقی کے کیا امکانات ہیں۔ ایک سب سے اہم کام وہاں یہ ہو رہا ہے کہ آبپاشی و زراعت پر موسم کے اثرات کا مطالعہ کیا جا رہا ہے اور ان موسمی موانع کو دور کیا جا رہا ہے جو کاشت میں حایل ہوتے ہیں۔

ایک نہایت عجیب کام وہاں یہ ہو رہا ہے کہ جنگلی پودوں کو جمع کر کے یہ تحقیق کی جا رہی ہے کہ ان میں زمین کے اندر کی کن کن معدنی چیزوں کے اجزا پائے جاتے ہیں۔ یہ کام وہاں ۲۰ سال سے ہو رہا ہے اور اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ زمین کے اندر جہاں جہاں جس قسم کی دھاتیں پائی جاتی ہیں، ان کا سراغ لگایا جائے۔ اس وقت تک اس ترکیب سے بہت سی ایسی نئی دھاتیں انھوں نے دریافت کر لی ہیں جن کا انھیں تصور بھی نہ ہو سکتا تھا۔

یہاں ہوا کی مدد سے بجلی بھی پیدا کی جاتی ہے، اور آبپاشی کے لئے کنووں سے پانی بھی کھینچا جاتا ہے۔ دریائے واگا کے کنارے کنارے سے ہوائی پنکھے لگے ہوئے ہیں، جو گردش میں آکر مشینوں کو چلاتے اور بجلی پیدا کرتے ہیں ان کی مدد سے کنووں اور نہروں کا پانی بھی کھیتوں تک پہونچایا جاتا ہے اس جگہ غالباً نامناسب نہ ہوگا اگر طبی و صنعتی دنیا میں ان کے بعض اہم اکتشافات کا ذکر کیا جائے۔

۱۔ انھوں نے ایک ایسی روشنی پیدا کر لی ہے جو بالکل سورج کی روشنی کی طرح ہے لیکن اس سے آنکھ نہیں چوندھیاتی۔

۲۔ انھوں نے ایک قسم کا ایسا لوہا بنا لیا ہے جو بالکل فولاد کی طرح کام دیتا ہے۔

۳۔ ایک نئی قسم کی سیمنٹ انھوں نے طیار کی ہے جو سکڑتی اور سمٹتی نہیں، امریکہ اور برطانیہ ابتک اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے

۴۔ زمین کھودنے کی ایک اتنی بڑی مشین انھوں نے بنالی ہے جو بیک وقت ۷۰ کروڑ پونڈ مٹی کھود کر پھینک دیتی ہے یہ مشین پورا ایک مکان ہے جو پہیوں کی بجائے ہائڈرالک اصول سے چلایا جاتا ہے۔

۵۔ بجلی پہونچانے کا ایک نیا طریقہ جس کے ذریعہ سے ۴۰۰ میل تک برقی قوت برائے نام خرچ پر پہونچائی جا سکتی ہے،

تاشقند میں ایک پارچہ بافی کا انسٹی ٹیوٹ ہے۔ یہ ۱۹۳۲ء میں قایم ہوا تھا۔ لیکن اب بیس سال کے اندر طلبہ کی تعداد دس گنی ہو گئی ہے اور آیندہ ۵ سال میں پندرہ گنا ہو جائے گی۔ اس ادارہ سے ہر سال سیکڑوں ماہرین باہر نکلتے ہیں جو کارخانوں اور دوسرے سائنٹفک اداروں میں کام کرتے ہیں

ادارہ کی لائبریری میں ایک لاکھ ۵۰ ہزار کتابیں ہیں جن سے طلبہ فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس وقت طلبہ کی تعداد وہاں ۱۵۰۰ ہے جن کو وظایف دیاتے ہیں اور عملی تعلیم کے لئے پارچہ بافی کے کارخانوں میں بھیجا جاتا ہے۔ اس ادارہ پر حکومت ایک کرور روبل سالانہ صرف کرتی ہے۔ اس ادارہ سامی میں رنگین روئی پیدا کرنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے جس سے یوروپ وامریکہ اب تک بالکل ناواقف ہے۔

کاتنے اور بُننے کے سلسلہ میں انھوں نے بڑے بڑے مشین کرگھے بنائے ہیں جو از خود کام کرتے ہیں اور کسی آدمی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ازبکستان روئی کا گھر ہے جسے وہاں کے لوگ سفید سونا کہتے ہیں۔ اس سے پہلے یہاں کی روئی دوسری جگہ بھیجدی جاتی تھی، لیکن اب خود یہیں بافی کے بڑے بڑے کارخانے قایم ہوگئے ہیں اور روئی کے بجائے اب یہاں سے کپڑا باہر کو بھیجا جاتا ہے جو بہت زیادہ نفع بخش چیز ہے۔

یہاں کے سائنس دانوں نے پیوند و قلم کے ذریعہ سے یہ معلوم کرلیا ہے کہ پودوں کی خصوصیات بدلی جاسکتی ہیں۔ ایک ماہر لائی سنکو نے ثابت کیا ہے کہ اگر کوئی تخم ایسی جگہ بویا جائے جہاں کی زمین اس کے موافق نہیں ہے تو وہ نئی زمین میں بھی اُگ سکتا ہے لیکن اس کی خصوصیات طبعی بدلجاتی ہیں اور وہ اپنے نئے ماحول سے متاثر ہوکر ایک دوسرے پودے کی شکل میں نشو ونما پاسکتا ہے۔ وہ ایک ہی قسم یا نوع کے پودوں کی قلم ایک دوسرے میں لگاتے بلکہ بستانی اور صحرائی پودوں میں باہم پیوند کرکے تجربات کررہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اسی طرح گیہوں کی متعدد قسمیں پیدا کرلی ہیں، اور جوہوں کا درخت انھوں نے ایسا پیدا کرلیا ہے جس میں دوسرے درختوں کی طرح شاخیں پیدا ہوتی ہیں۔

طبی دُنیا میں بھی ان کی ایجادیں حیرتناک ہیں۔ ایک ڈاکٹر واسلی یوپوف نے ایک خاص سیرم ایجاد کیا ہے اور ادنیٰ درجہ کے جانوروں پر تجربہ ثابت کیا ہے کہ اگر ان کے جسم کا کوئی حصہ علٰحدہ ہوجائے تو وہ پھر پیدا ہوسکتا ہے۔ اس طرح اس نے ۴۰ اندھے چوہوں میں پھر از سر نو آنکھیں پیدا کیں۔ الغرض روس میں سائنس بڑی زبردست ترقی کررہی ہے، لیکن اس کا مقصود ہلاکت پھیلانا نہیں بلکہ نوع انسان کی خدمت کرنا ہے۔

مذہبی آزادی سوویٹ حکومت پر اہلِ مذاہب کا سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ مذہب کی دشمن ہے، حالانکہ اس میں مطلق صداقت نہیں ہے اگر تم روس میں ریل یا ہوائی جہاز پر سفر کرو تو تم ہر شہر میں مسجدوں اور کلیساؤں کو دیکھتے ہوئے گزر جاؤ گے، کیونکہ روس میں کوئی ایسا گاؤں ایسا نہیں ہے جہاں مسجد و کلیسا نہ پایا جاتا ہو۔ پھر یہی نہیں کہ یہ مساجد پرانی ہوں، بلکہ ان میں سے اکثر نئی ہیں یا وہ ہیں جن کی مرمت ابھی میں حکومت کی طرف سے کی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سوویٹ حکومت خالص نامذہبی حکومت ہے اور مذہب کو حکومت سے بالکل علٰحدہ کردیا گیا ہے لیکن وہاں کسی مذہبی کو نہ ترک مذہب پر مجبور کیا جاتا ہے نہ اس کے مذہبی اعمال میں کوئی روک پیدا کی جاتی ہے، وہاں ہر شخص آزاد ہے جو مذہب چاہے اختیار کرے حکومت مذہب کے خلاف کوئی پروپاگنڈا نہیں کرتی۔

سوویٹ مدارس میں یقیناً مذہبی تعلیم نہیں ہوتی، لیکن یوں لوگ آزاد ہیں اور اپنی مذہبی تعلیم کلیساؤں مسجد یا گھروں میں حاصل کرتے ہیں۔

ماسکو میں ۱۹ اگرجا ہیں جن میں سے بعض بڑے شاندار ہیں۔ انقلاب سے قبل ان میں سے بعض بہت بری حالت میں تھے لیکن بعد کو سوویٹ حکومت نے رقم صرف کرکے ان کی مرمت کرادی۔ خود کریملن کے قصر کے احاطہ جو زار کا محل تھا اور اب سوویٹ حکومت کا صدر دفتر ہے، کلیسا موجود ہے اور اسے چھیڑا نہیں گیا۔

روس اور جارجیا کے کلیساؤں کی تعداد ۲۰ ہزار سے کم نہیں اور لاکھوں رومن کیتھولک عقاید کے عیسائی ان میں جاکر عبادت کرتے ہیں۔

عیسائیوں کے بعد روس کی سب سے بڑی آبادی مسلمانوں کی ہے جو زیادہ تر وسط ایشیا کی جمہوریت میں پائی جاتی ہے۔ میں تاشقند کی میں وہاں کے مفتی سے ملا۔ یہ ملاقات مسجد کی لائبریری کے کمرے میں ہوئی جو بہت صاف ستھرا تھا اور جہاں مذہبی علماء بھی موجود تھے۔ انھوں نے کہا ں سے باہر یہاں کے مسلمانوں کے متعلق بڑی غلط خبریں مشہور کی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ روس کے مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہے، ل خود یہاں آئیں اور دیکھیں کہ ہم کیسی اطمینان کی زندگی بسر کررہے ہیں، کس طرح آزادی سے اپنے تمام مذہبی مراسم ادا کرتے ہیں، ہماری مسجدوں ین کے موقع پر ۶۰، ۷۰ ہزار مسلمان ایک ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ نائب امام نے کہا کہ "انقلاب سے پہلے ہماری حالت قریب قریب وہی تھی

جو ہندوستان کی تھی۔ ہم میں ۹۰ فی صدی جاہل تھے اور حکومت میں ہم ازبکیوں کو کوئی ملازمت نہ مل سکتی تھی، لیکن اب حالت بالکل بدل گئی ہے۔ اب ہمارے یہاں سب پڑھنا لکھنا جانتے ہیں اور کسی نہ کسی کام میں لگے ہوئے ہیں۔

میں نے ان لوگوں کے ساتھ کھانا کھانا اور ایسا محسوس کیا کہ ہندوستان ہی کے کسی مسلم گھرانے میں موجود ہوں، کیونکہ کھانے کے اقسام اور کھانے کا طریقہ ہندوستان ہی کے مسلمانوں کا سا تھا۔ مجھے دورانِ گفتگو میں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ لوگ دُنیا کی سیاسیات سے بھی پوری طرح واقف ہیں اور تمام بین الاقوامی مسایل پر سوچی سمجھی رائے ظاہر کرتے ہیں۔

تاشقند میں ۲۰ مسجدیں ہیں اور ان سب میں باقاعدہ نماز ہوتی ہے۔ انقلاب سے پہلے مساجد کی آمدنی بہت خراب حالت میں تھی، لیکن اب تمام آمدنی و خرچ ایک بورڈ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ مساجد کی آمدنی کا ذریعہ زیادہ تر عطیات ہیں۔ یہاں مزارات کی زیارت کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں اور ان سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ مساجد ہی پر صرف کی جاتی ہے۔ تاشقند کے مرکزی مذہبی بورڈ کے پاس اس وقت ۲۰ لاکھ روبل جمع ہیں اسی آمدنی سے مذہبی مدارس چلائے جاتے ہیں اور موذنوں، اماموں کی تنخواہیں دیجاتی ہیں۔

بخارا میں ایک بہت بڑا مدرسہ ہے اور کہا جاتا ہے کہ وسط ایشیا میں اس سے بہتر مدرسہ کوئی نہیں۔ اس مدرسہ سے جو علماء نکلتے ہیں انھیں امامت کی خدمت سپرد کی جاتی ہے۔

یہاں مسجد کے اماموں اور قاضیوں، مفتیوں کو بڑی معقول تنخواہ ملتی ہے۔ جن کی تعداد صرف جمہوریت ازبک میں ۵۵۰ ہے۔

مسجدوں میں عموماً قرآن کی تعلیم ہوتی ہے اور اس درس میں ہر شخص شریک ہو سکتا ہے، یونہ ہر محلہ میں مسجدیں ہیں جہاں پنج وقتہ نماز ہوتی ہے لیکن جامع مسجد میں صرف جمعہ کے دن نماز ادا کیجاتی ہے جس میں ہزاروں آدمی شریک ہوتے ہیں۔ عورتیں بالعموم گھروں میں نماز ادا کرتی ہیں۔ جمعہ کے دن البتہ بعض عورتیں جامع مسجد بھی ہیں اور ان کے لئے ایک علٰحدہ حصّہ مخصوص ہے۔

ہر مسجد کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی ہوتا ہے جس سے لوگ استفادہ کرتے رہتے ہیں لیکن مرکزی بورڈ کا کتب خانہ بھی بہت بڑا ہے اور یہاں سے وقت ضرورت دوسرے مقامات کو بھی کتابیں فراہم کی جاتی ہیں۔

یہاں ہر جمعہ گویا تہوار کا دن ہوتا ہے اور عیدین کی تقریب بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے۔ میں یہاں کے مسلمانوں کی حالت دیکھ بہت خوش ہوا اور جس وقت میں نے اپنے وطن ملابار کے مسلمانوں کی حالت سے ان کا مقابلہ کیا تو بہت افسوس ہوا کیونکہ میرے ہم وطن مسلمان حد درجہ پست حالت میں ہیں اور ان کا ذہنی انحطاط افسوسناک حد تک پہونچ گیا ہے۔

رعایتی قیمت سے فایدہ اُٹھایئے

من ویزداں	مجموعۂ استفسارات مذہبی	مکتوبات نیاز ہر سہ جلد
مع	مع	عہ
شہوانیات	قول فیصل	شہاب کی سرگزشت
للعہ	عہ	عہ

ان کتابوں کی مجموعی قیمت علاوہ محصول ڈاک تنتیس (۳۳) روپیہ ہوتی ہے اور محصول ڈاک ملاکر تقریباً ۳۶ روپیہ۔ لیکن یہ تمام کتابیں اکٹھا منگانے پر آپ کو مع محصول صرف تیس (۳۰) روپیہ میں مل سکتی ہیں، اگر آپ رقم پیشگی بھیجدیں۔ وی، پی نہیں بھیجا جائے گا۔

منیجر نگار لکھنؤ

رضوان سے کہدو

"تو ایک اچھا سا خط کیوں نہیں لکھ ڈالتے ؟"

"خط !"

"ہاں ! ہاں ! خط ! کسی عزیز کو، کسی دوست کو، کسی ——"

"مگر اب تو کوئی باقی نہیں رہا جس کو خط لکھ سکوں — ابھی چند ہی روز تو ہوئے کہ میں نے ایک خط، نہایت اچھا خط، شوکت کو لکھا تھا۔ یہ دوسری ہے کہ اس کا اب تک جواب نہیں آیا۔ مگر آئے گا، مجھے امید ہے ضرور آئے گا۔ اور پرسوں، ہاں پرسوں ایک خط (مگر شوکت والے خط جتنا اچھا نہیں) محمود کو ایک خط یونس کو۔ دوسرا اسی دن شام کے وقت ڈاک نکلنے سے قبل راجندر کو۔ کتنے ہوئے ؟ - ایک - دو - تین - ٹھیک ! اور کل تو ایک دم پانچ خط لکھ تمام دن خطوں ہی کے نذر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب ایک نہیں، دو نہیں، بلکہ ایک دم پانچ خط لکھے جائیں گے تو سب کے سب اچھے نہیں ہو سکتے۔ البتہ تیرے ں نے اچھا بنانے کی انتہائی کوشش کی۔ اس کے لئے مجھے بازار جانا پڑا دھوپ میں، یعنی تین میل کی مسافت محض اس لئے طے کی کہ خوشنما کاغذ خریدا اور جب یہ تمام مراحل طے کر کے لکھنے بیٹھا تو معمولی روزمرہ کے استعمال میں آنے والے الفاظ سے تسلی نہ ہوئی۔ دماغ لڑانا پڑا۔ حسین دلنشیں، موثر الفاظ لوکر یدکر یدکر نکالے اور نہایت اطمینان سے آہستہ آہستہ، اُن کو صفحۂ کاغذ پر منتقل کر دیا۔ گویا واقعی ایک اچھا خط لکھ ڈالا ! اور اتنی کاوش کیوں نہ جاتی ! وہ خط — تم تڑپنے کیوں لگے ؟ ابھی تو میں نے اس کا نام نہیں لیا ! — وہ خط راحتِ روح، دشمنِ ہوش، سکونِ جاں، غارتگرِ ایمان — ہاں اُسی کے نام تو تھا جس کے ذکر سے تم اس قدر مچل جاتے ہو، کیا اب بھی یہ بتانے کی ضرورت رہ گئی کہ باقی دونوں خط چند منٹ میں لکھ ڈالے ؟ — کا تمام اشتیاق تو تیرے خط کی نذر ہو چکا تھا۔ اب ان آخری خطوں کے لئے وہ جوش کہاں سے آتا، مجھے ان دونوں دوستوں سے جن کو یہ آخری خط نذر تھا۔ اب ان آخری دو خطوں کے لئے وہ جوش کہاں سے آتا، مجھے ان دونوں دوستوں سے جن کو یہ آخری خط یقیناً مل چکے ہوں گے، دلی ہمدردی ہے نفرتا۔ مجبور تھا۔"

سُرخ بالوں والی شہرۂ آفاق اکٹریس، سارہ برن ہارٹ کی تصویر، وہ سارہ جس کی اداکاری نے وکٹر ہیوگو کے دل کو اتنا موہ لیا تھا کہ ایک شب ں آنکھوں سے تھیٹر ہال میں ہی آنسو بہہ نکلتے تھے، میرے سامنے کی میز پر تھی۔ مگر میری آنکھیں کھڑکی سے باہر بارش کے منظر میں غرق تھیں، یر ادماغ صدہا سال کے اوراق اُلٹ کر فرانس کے ایک تھیٹر ہال میں ایک عورت کے سحر کار فن پر ایک نامور فسانہ نگار کے قیمتی آنسو بہنے کی یر دیکھنے میں محو تھا کہ یکایک پھر اُسی آواز نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا :-

"کیا ان قیمتی لمحات کو یونہی گنوا دو گے ؟ اگر چاہو تو اب بھی ایک خط لکھ سکتے ہو، ایک اچھا خوبصورت خط !"

"مگر کس کو ؟ یہی تو میں جانتا نہیں !"

"اپنے آپ کو !"

"کیا کہا ؟" میں اپنی جگہ پر اُچھل پڑا۔ "پاگل تو نہیں ہو گئے ؟"

"پاگل ؟ نہیں، میں تو نہیں۔ مگر تم ضرور ہو جاؤ گے اگر اسی طرح تصورات کا شکار بنے رہے۔"

"پاگل ؟ نہیں، میں تو نہیں۔ مگر تم ضرور ہو جاؤ گے اگر اسی طرح تصورات کا شکار بنے رہے۔"

سُرخ بالوں والی ساحرہ کا جسم مجھے ناچتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ میں نے اپنے سر کو جھٹکا دیکر اس تصویر کو ذہن سے علیحدہ کر دیا اور ایک حد تک خیالات مجتمع کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ مجھے یہ کیسی عجیب و غریب ترغیب دی جا رہی تھی ! اپنے آپ کو خط لکھنا ! بھلا کوئی ذی ہوش

انسان اس سے زیادہ مضحکہ خیز حرکت کا بھی مرتکب ہو سکتا تھا؟ اپنے آپ کو خط!

"کس سوچ میں ہو؟ شاید تم سمجھتے ہو کہ مذاق کر رہا ہوں، مگر تم میرا مطلب ہی نہیں سمجھے۔ اپنے آپ کو خط لکھنے سے میری یہ مراد ہرگز نہیں تم اپنی زندہ ذات کو مخاطب کرو۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس۔ یعنی ۔۔۔۔۔۔۔۔"

"میں سمجھ گیا!" میں نے سناٹے میں آکر کہا۔ "تم چاہتے ہو کہ میں اپنے آپ کو مردہ تصور کر لوں اور اپنی روح کو جو ایسی حالت میں کسی اور میں ہوگی مخاطب کروں"

میری زبان نے الفاظ ادا تو کر دئے مگر اب میرے جسم کا ریشہ ریشہ کانپنے لگا۔ باہر بارش کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔

"بالکل ٹھیک سمجھے! بس اب لکھ ڈالو، ایک ایسا خط جو کبھی کسی نے نہ لکھا ہو، جو اپنی نظیر آپ ہی ہو ——"

میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ میز پر پڑی ہوئی کتاب مجھے گھومتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ کمرے کی دیواریں میرے گرد طواف کرنے لگیں۔ باہر زمین اور آسمان جھولا جھولنے لگے۔ دائیں بائیں، بائیں دائیں ۔۔۔۔۔!

"ہاں! ایک اسی قسم کا ایک خط لکھ ڈالو۔" میرے کان سنتے چلے گئے۔ اور اس کا مواد خود اپنی زندگی سے لو۔ کیونکہ اس سے بہتر مواد تمہیں اور کہاں سے دستیاب ہوگا؟ آخر زندگی کیا ہے؟ مرقع حوادث یا یوں کہہ لو کہ ظفر مندیوں اور ناکامیوں کا ایک مجموعہ اور کیا تمہاری زندگی میں واقعات کی کمی ہے؟ کیا اگر تمہیں موقع دیا جائے تو تم بہت کچھ کہنے کے لئے بیتاب نہ ہوگے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ ضرور ہوگے۔

"بس! بس!" میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر یکایک اٹھا۔ "میں نے سب کچھ سن لیا۔ میں ایسا ہی کروں گا۔ لکھوں گا، ابھی لکھوں گا گویا کہ میرا وجود اب اس دنیا سے کسی اور دنیا میں منتقل ہو گیا۔ مگر میں وعدہ نہیں کر سکتا کہ میری کوشش کا نتیجہ ایک خوبصورت خط ہوگا، بہت ممکن ہے کہ جب لکھا جا چکے تو خوبصورتی کا اس میں ایک شائبہ بھی نہ پایا جائے۔ مگر اتنا وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ جو کچھ لکھوں گا سچ لکھوں گا۔ دروغ سے مجھے نفرت ہے۔"

فوراً اٹھا شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا، کاغذ نکالا اور میز پر جھک گیا۔ گویا کہ دنیا میں اس وقت اس سے زیادہ اہم کام اور کوئی نہ تھا۔ میں اس وقت کارکنانِ قضا و قدر کے ساتھ پہلی بار ایک انوکھے طریقے سے سنبرد آزمائی کر رہا تھا!

قلم صفحۂ کاغذ کے قریب پہونچکر یکایک رک گیا۔

اس دوسرے جہان والے اپنے آپ کو کس نام سے یاد کروں! کیا وہاں بھی وہ اختر ہی کہلاتا ہوگا۔ میں نے سر اوپر اٹھا کر غیر ارادی طور پر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بارش اب بھی تیزی سے ہو رہی تھی، کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے جس کے پتے اب پانی کا بوجھ نہ سہار سکتے تھے، ایک بکری کا بچہ پناہ لینے کے لئے آکھڑا ہوا تھا۔ مگر پانی کی دھاریں بے رحمی سے اس کے جسم پر تازیانے لگا رہی تھیں۔ وہ ٹھٹھر رہا تھا اور بار بار گردن کو دائیں بائیں موڑ کر نظر دوڑا رہا تھا۔ کیا وہ راستہ بھول کر ادھر آنکلا تھا اور اس غیر مانوس ماحول سے خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا؟ کیا اسے کسی قسم کی مدد پہونچنے کی امید تھی؟ کیا اس کی ماں اس کی تلاش میں اس طرف آرہی ہوگی؟ کون کہہ سکتا تھا کہ اس وقت اس گمشدہ بچے کے دماغ میں کیسے کیسے خیالات پیدا ہو رہے تھے؟ "گمشدہ بچہ! گمشدہ! گمشدہ!" یکایک میں نے یہ الفاظ زیرِ لب دہرائے۔ ہاں! ہاں! اسی نام سے تو مجھے اس دوسرے جہان والے اپنے آپ کو یاد کرنا چاہیے کیونکہ وہ بھی تو ایک گمشدہ ہی ہوگا۔

قلم کی نوک اب کاغذ کی سطح سے جا ملی اور میری آنکھوں کے سامنے پہلے الفاظ اور پھر رفتہ رفتہ سطور نمودار ہونے لگیں۔

"اے گمشدہ دوست" میں نے لکھنا شروع کیا۔ "ایک طویل عرصے سے تم اس جہان سے دور کسی ایسی دنیا میں، جس کو اس دنیا کی کسی آنکھ نے آج تک نہیں دیکھا، لیکن جس کا ایک خیالی خاکہ پھر بھی لوگوں کے دماغوں میں موجود ہے، مگر جو بات بعید از فہم ہے وہ یہ ہے کہ آخر تمہیں کیا سوجھی کہ عالم شباب ہی میں اس جہان کو چھوڑ کر چل دئے۔ شاید تم خیال کرتے ہوگے کہ تمہارا نہ ہونا اس دنیا والوں کے دلوں پر شاق گزرے گا اور تمہارے لئے لوگ صف ماتم بچھائیں گے۔ مگر کیا تم کو معلوم ہے کہ اب کسی کو اتنا احساس بھی نہیں کہ تم اس دنیا میں کبھی تھے بھی یا نہیں، کیا تمہیں یہ بات عجیب و غریب نہیں

اور کیا یہ سُن کر تمھارے قلب میں کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوتا ؟

مگر بہت ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو اور تم اس جہان والوں سے اتنے ہی بے نیاز ہو جتنے کہ یہاں والے تم سے ہیں۔ اس صورت میں صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اُس نادیدہ کائنات میں تم وہاں ہو جہاں ہر سو خوشی ہی خوشی ہے۔ جہاں ماضی کی یاد کسی کو نہیں ستاتی۔ جہاں فردا کا کوئی غم نہیں، ہی میں سب مست رہتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ اس دُنیا میں تمھاری مختصر زندگی مصائب کا ایک لامتناہی سلسلہ تھی تم نے پھر بھی حتی الامکان نہ صرف اپنے ہم جنسوں بلکہ غیر کا تکالیف کو رفع کرنے کی کوشش کی اور جبر و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جس کے صلے میں غالباً تمھیں اُس خطے میں جگہ ملی ہے جو شندوں کے خیال کے مطابق تم ایسے لوگوں کے لئے روز ازل سے مخصوص ہے۔ پھر بھی حیرت ہوتی ہے کہ تم نے کیونکر ایک ابدی آسایش اور ندگی کو یہاں کی کشمکش والی زندگی پر ترجیح دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اس دُنیا میں اپنی مختصر حیات کے دونوں دور بھول چکے ہو تو سنو، غور ن ہے کہ وہ پردہ جو اب تمھاری آنکھوں پر پڑا ہوا ہے ہٹ جائے اور تمھیں حقیقت کی ایک جھلک بیتاب کر دے۔

تمھاری زندگی کے صرف دو دور تھے۔ بچپن کا زمانہ اور عالمِ شباب۔ بڑھاپا آنے سے پیشتر ہی تم نے اس جہان کو خیرباد کہہ دیا۔ تمھارے بچپن کے بیشتر واقعات ایک ہی قسم کے تھے۔ حقیقی مسرت تمھیں شاذ و نادر ہی نصیب ہوئی ہوگی اور پریشانیاں تمھاری زندگی کا ایک جزو لاینفک ں۔ اسی زندگی کے چند اہم واقعات کا نقشہ اب تمھاری آنکھوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے:۔

جب تم پانچ برس کے تھے ایک دن یکایک تمھارے دل کو یہ دیکھ کر دھکا سا لگا کہ تمھاری ماں کی اُنگلیاں جو اس وقت چکّی پر آٹا پیسنے میں ں سوجی ہوئی تھیں۔ تم بھاگے بھاگے اُس کے پاس گئے اور تم نے پوچھا:۔

ں! یہ تمھاری اُنگلیوں کو کیا ہوا ؟'

ھاری ماں نے دوپٹہ کے آنچل سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا:۔

بیٹا، چکّی چلانے سے سوج گئی ہیں'

چکّی چلانے سے! بہت درد ہوتا ہوگا ؟

ں بیٹا!، تمھاری ماں نے محبت بھری نظروں سے تمھاری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

م نے ایسا محسوس کیا جیسے کسی نے تمھارے ننھے سے دل میں سوئی چبھو دی ہو۔

ں! تم یہ کام چھوڑ کیوں نہیں دیتیں ؟'، تم نے کچھ سوچ کر کہا۔

بیٹا۔ پھر کھائیں گے کہاں سے ؟

نو کیا جو لوگ کھاتے ہیں ان سب کی اُنگلیاں تمھاری طرح سوج جایا کرتی ہیں ؟' تم نے معصومیت سے پوچھا۔

نہیں۔ میرے لعل! تمھاری ماں نے تمھیں اپنی گود میں کھینچتے ہوئے کہا۔ جو لوگ امیر ہیں اور جن کے پاس دھن دولت کی کمی نہیں اُن کو سانی سے مل جاتا ہے۔ اُن کو ایسے کام کبھی نہیں کرنے پڑتے۔ اسی لئے اُن کی اُنگلیاں بھی نہیں سوجتیں'

اس وقت دولت کا مطلب تو نہ سمجھے مگر تم وہاں رُک نہ سکے۔ ماں کی آغوش کو چھوڑ کر باہر بھاگے۔ جب باہر پہونچے تو تمھاری آنکھوں سے موٹے آنسو گر رہے تھے۔

ک روز تم بازار سے گزر رہے تھے۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب تم کچھ بڑے ہو چکے تھے۔ اُس روز تم نے دیکھا کہ بہت سے لوگوں کے چہرے پژمردہ امر پر غور کر رہے تھے کہ یکایک فضا میں ایک غوغا سا بلند ہوا۔ تم نے گردن کو موڑ کر دیکھا تو حیران رہ گئے۔ کچھ لوگ جن میں سے بعض اپنے ہاتھوں اور پتھروں کے ٹکڑے سنبھالے ہوئے تھے ایک نحیف جسم کے کتے کا تعاقب کر رہے تھے۔ کُتے کا جسم زخمی تھا۔ وہ چیختا ہوا آگے آگے بھاگ رہا ینا!'' ''جانے نہ پائے!'' کی صداؤں کے ساتھ اُس پر پتھر برسائے جا رہے تھے۔ تم نے مُڑ کر اپنی ضعیف ماں کی طرف دیکھا۔ اُسکی آنکھوں

ہی نے تمہارے نہ پوچھے ہوئے سوال کا جواب دیدیا۔" ہاں - بیٹا۔ اس دُنیا کا یہی دستور ہے۔" تم نے سر جھکا لیا اور ماں کے ہمراہ آگے چلدئے ایک دوکان پر تازہ مٹھائی کی خوشبو نے تمہاری توجہ کو اپنی طرف راغب کیا۔ ماں نے تمہارا ارادہ بھانپ کر تمھیں چند پیسے دئے اور کہا:- "لو بیٹا لے لو، ہم لوگ روز روز کہاں ادھر آتے ہیں!" مٹھائی لیکر تم کھانے ہی کو تھے کہ ناگاہ تمہاری نظر چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے ایک زخمی کُتّے پر جا پڑی۔ تمہارا ہاتھ وہیں رُک گیا تم اس کُتّے کو پہچان گئے تھے۔ یہ وہی مظلوم تھا جس کا ان لوگوں نے تعاقب کیا تھا۔ تم نے ایک نظر ماں کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے کُتّے کے قریب پہونچ گئے۔ تم ڈر رہے تھے کہ شاید تمھیں دیکھکر وہ بھاگنے کی کوشش کرے۔ مگر کُتّے بھی انسانوں اور انسانوں میں تمیز کرلیتے۔ وہ بھاگا نہیں۔ تم نے خوشی خوشی تمام مٹھائی اُس کے آگے ڈال دی اور جب اُس نے اُس کو کھانے کے لئے سر جھکایا تو تم اپنی ماں کی طرف لوٹ آئے۔ تمہاری ماں نے کہا:- "بیٹا میں بہت خوش ہوں، خدا تمھیں اور نیک کام کرنے کی توفیق دے۔"

تمہارے والد تمہاری پیدائش سے پہلے ہی وفات پاگئے تھے۔ اسی لئے باپ کی عدم موجودگی تمہارے لئے چنداں باعث تشویش نہ تھی۔ من کبھی کبھی دوسرے بچّوں کے باپ دیکھ کر تمہارے قلب میں ایک خلش سی محسوس ہوتی۔ مگر جب بارہ برس کی کچّی عمر میں، تمہاری زندگی کے اُس نازک دور میں جب کہ تمھیں ماں کی رہنمائی کی سخت ضرورت تھی، دستِ اجل نے اس سایۂ رحمت کو بھی تمہارے سر سے اُٹھا لیا تو تمہاری دُنیا آناً فاناً تاریک ہوگئی۔ موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا تمہاری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا اور تم اس کی تاب نہ لاسکے۔ کیا تمھیں وہ رات یاد ہے جب تم نے تنِ تنہا اپنی ماں کے بے حس جسم کے پاس دو زانو بیٹھے بیٹھے صبح کردی؟ کیا تمہارے کانوں کو اب بھی وہ دلدوز صدائیں سنائی دیتی ہیں جو ایک یتیم بچّے کے دل سے اپنی بے جان ماں کے لبوں سے پیار کے دو لفظ سننے کے لئے شب بھر نکلتی رہیں؟ یہ خواب و خیال کی باتیں ہیں، مگر اتنا تو یاد ہوگا کہ دن چڑھے جب تمھیں نیند سے بیدار کیا گیا جس نے سحر ہونے سے چند ساعت قبل تم پر غلبہ پالیا تھا تو تم پر ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ تمھیں معلوم ہوا کہ تم دُنیا میں قطعی لاوارث نہ تھے۔ بلکہ ایک چچا اور چچی بھی رکھتے تھے۔ تم نے یہ معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہ کی کہ تمہاری ماں کی حیات میں وہ کیوں روپوش رہے۔ یا یہ کہ اس وقت تمہارے ہاں کیسے آپہونچے۔ بہرحال تمہارے چچا نے تمہاری ماں کی تجہیز و تکفین اپنے ذمہ لی اور اُسی روز سے اُن کے کہنے پر تم اُن کے ہاں رہنے لگے۔

"کچھ عرصے کے بعد تمہارے چچا نے تمھیں ایک کارخانے میں ملازم کرادیا، یہ تمہاری زندگی میں نئے باب کا آغاز تھا۔ تم نے اپنے زور بازو سے روزی کمانا شروع کردی تھی۔ شام کے وقت جب تم گھر لوٹتے تو مکان کے کسی گوشہ میں یا باہر چبوترے پر بیٹھے بیٹھے رات کردیتے کھیل کود کی طرف تمہاری طبیعت کا قطعی میلان نہ تھا، تمہارے چچا کی بیٹی بے حد چنچل اور کھیل کے بے حد شوقین جو قریباً تمہاری ہم عمر ہی تھی اکثر تمھیں اپنے کھیل میں شریک کرنے کے لئے ہر طریقے سے آمادہ کرنے کی کوشش کرتی۔ کبھی ایک دو آنسو نکال کر منت سماجت سے اور کبھی یہ دھمکی دیکر کہ "ہم تم سے کبھی نہ بولیں گے" تم اُس کی باتوں سے پریشان تو ضرور ہوتے مگر کسی نہ کسی بہانے سے اس کو ٹال دیتے یا بالکل چپ رہتے حتےٰ کہ وہ مجبور ہوکر تمھیں چھوڑ جاتی، اُسے کیا معلوم تھا کہ تمہارا دل بجھ چکا ہے۔ مگر تمہاری مستقل افسردگی اور علٰحدگی ہی اُس کے لئے باعثِ کشش تھی۔

"دو سال کے بعد تمہاری زندگی میں ایک زبردست انقلاب آیا۔ کارخانے کے مزدوروں کے مجبور کرنے پر تم نے کچھ عرصہ پیشتر تنخواہ ملنے کے روز لاٹری کا ایک ٹکٹ خریدا تھا۔ اُسی شام جب تم نے چچا کو اپنی تنخواہ کے آٹھ روپئے کی بجائے سات روپے دیتے وقت لاٹری کا تذکرہ کیا تو وہ لال پیلے ہوگئے اور تمھیں مار مار کر ادھ موا کردیا۔ یہی نہیں بلکہ تمھیں اُس وقت بھوکا رکھا گیا مگر اُسی شب ایک معصوم لڑکی نے ایک پیشین گوئی کی جو بالکل سچ ثابت ہوئی۔ جب مکان میں کامل خاموشی ہوچکی تو تمہارے چچا کی لڑکی اندھیرے میں تمہارے لئے کھانا لائی اور چلتے وقت کہہ گئی "جانے کیوں مگر مجھے یقین ہے کہ لاٹری آپ ہی کے نام نکلے گی" اور ایک دن تم پچیس ہزار روپے کے مالک بن گئے۔ سات ہزار روپیہ خرچ کرکے تم نے اپنے چچا چچی کے لئے ایک خوبصورت اور عالیشان مکان بنوادیا۔ سات ہزار اپنی چچیری بہن کے نام بنک میں جمع کروادیا۔ بقایا رقم میں سے ایک چھوٹا سا مکتب یتیم بچّوں کے لئے کھولنے کے بعد خود بیوپار شروع کردیا۔ اچانک دولتمند ہوجانے سے تمہارا دماغ بگڑا نہیں۔ تمہاری زندگی جوں کی توں سادہ رہی۔ اپنے کاروبار

ہ ساتھ تم نے لکھنا پڑھنا بھی سیکھنا شروع کیا اور کافی سیکھ لیا۔

یکایک ایک روز ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کے تاثرات نے تمھاری زندگی کی کایا پلٹ دی اور اس کو سراپا تلاطم بنا دیا۔ کیا تمھیں وہ شام یاد ہے جب تم خیالات میں ڈوبے ہوئے اپنے مکان کے پائیں باغیچے میں ایک آم کے درخت کے قریب گھاس پر کہنی کے بل لیٹے ہوئے چانک تمھیں ایک سریلی آواز نے چونکا دیا۔ کسی نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہیں آپ!" تم نے گھبرا کر اپنی پشت کی جانب دیکھا۔ تمھاری اپنی چچا کی لڑکی کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ تمھیں اپنی زندگی میں پہلی بار ہر اعتبار سے ایک نئے جذبے کا احساس ہوا۔ تم قدرے پریشان لر تم نے اپنی پریشانی کو چھپانا چاہا اور کہا:۔ "آؤ۔ آؤ۔ کیا چچا جان اور چچی جان کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں؟ وہ آگے بڑھی اور درخت کے ساتھ لگ کر تمھارے سامنے کھڑی ہو گئی اس کا ہر انداز تمھیں بے حد دلکش معلوم ہو رہا تھا۔ تم نے سر جھکا لیا کہ وہ تمھاری آنکھیں یکے۔ یہ کیسی محشر خیز خاموشی تھی جس نے تم دونوں کے لبوں پر مہر سکوت لگا دی! ادھر تمھارا دم گھٹا جا رہا تھا اور اُدھر اُس کا! مگر عہد لی ایسی خاموشیاں زیادہ دیر تک قایم نہیں رہ سکتیں، خواہ دونوں فریقین کتنا ہی ضبط کیوں نہ کریں۔ یہی اس وقت بھی ہو۔ کیسے ہوا؟ اکرنے کی تمھیں مہلت ہی نہ ملی۔ تم صرف اتنا محسوس کر سکے کہ تمھارے شانے پر گرم گرم آنسو امڈ کر بہ رہے تھے اور تمھارے کانوں نے ایک وغریب التجا سنی:۔ "آپ مجھے کبھی نہ جانے دیں۔ آپ میری زندگی کو پامال ہونے سے بچا لیں، اس وقت تمھاری روحیں ایک دوسرے میں ہو جانے کے لئے بیتاب تھیں، ہمیشہ کے لئے۔ مگر ہوا کیا؟ وہی جو اکثر ہوا کرتا ہے۔ اس کی نسبت تو تمھارے چچا چچی نے مدت ہوئی ایک نوجوان ی تھی اور آخر ایک شب وہ تم سے اور تم اُس سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دئے گئے اور وہ بھی اس طرح کہ دونوں اس ابدی مفارقت کے موقع لذتِ دید سے محروم رہے۔ تمھارے ارمان تمھارے دلوں ہی میں رہ گئے، مگر لب پر ایک حرف نہ آیا۔ اُس شب جب برات گئی ہے تو بارش ہو اور جب دولہا دلہن کی پھولوں سے لدی موٹر گزری تو تم ایک درخت کے نیچے تاریکی کے پردے میں کھڑے بھیگ رہے تھے اور تمھاری آنکھیں لی طرح برس رہی تھیں۔

"یہی وہ سانحہ تھا جس کے کچھ عرصہ بعد تم ایک دن ہماری دُنیا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلدئے اور آج تک لاپتہ ہو"

"اے گمشدہ دوست! اب تم ہی بتاؤ کہ ان حالات میں تمھارا اُس جہان میں دائمی جمود کی زندگی بسر کرنا کہاں تک بجا ہے؟ کیا ان تمام واقعات ھیں کبھی نہیں ستاتی؟

"جس دُنیا کے باشندوں کو جسم و جان کا باہمی ارتباط قایم رکھنے کے لئے محنت شاقہ کبھی نہ کرنی پڑے اور جو افلاس کی زد سے بالکل محفوظ جہاں ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ خواہش اس کا خیال ہی دل میں لانے سے چشم زدن میں پوری ہو جائے وہ دُنیا بھی رہنے کے قابل ہے

"جس دُنیا میں وہ مسرت عنقا ہو جو مظلوم و بے زبان جانداروں کا پیٹ بھر کر اور خود نعمتوں سے محروم رہ کر حاصل ہوتی ہے۔ ایسے جاندار فریح طبع کے لئے پتھر برسائے جاتے ہیں، جن کی چیخ و پکار پر خوشی کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں، مگر جن کا تمھاری دنیا میں شاید گزر بھی ممنوع ۔ "جس فضا میں آہ و بکا کی وہ روح فرسا صدائیں کبھی نہیں سُنائی دیتیں جو یہاں کم عمر بچوں کے یتیم ہو جانے پر اُن کے دلوں سے نکلتی ہیں دافلاک کو متزلزل کر دیتی ہیں۔ وہ بچے جن پر کم سنی ہی میں مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں جنھیں وہ نہ معلوم کس قوت سے جھیلتے جھیلتے ہی ہو جاتے ہیں اور جن کا پیمانۂ حیات سسکتے سسکتے ہی لبریز ہو جاتا ہے۔

جس عالمِ بسیط میں جنس محبت اس قدر نادراں ہے کہ تو وہاں کے باشندے خونِ تمنا کے نام سے واقف ہیں اور نہ سوز دروں سے کلیجے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ جہاں دو دل ایک دوسرے کی محبت میں سرشار ہو جاتے ہیں اور ایک کو ہر لحظہ دوسرے کی جستجو رہتی ہے اور ں کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کو کبھی جدا نہ کیا جائے کہ جدائی اُن کے لئے تمام کائنات کو تاریک کر دے گی تو ایسی حالت میں کوئی غیر مرئی انھیں داغِ مفارقت دیکر لطف اندوز نہیں ہوتی۔ اُن کے آنسو بہانا نہیں چاہتی۔ اُن کے ارمانوں کا خون نہیں ہونے دیتی۔ بلکہ اُن لمحاتِ کو جو محبت کرنے اور کئے جانے پر حاصل ہوتے ہیں اور جن کی زندگی ہماری دنیا میں آنکھ جھپکتے ہی بیت جاتی ہے وہ ایک عمر جاوداں

عطا کر دیتی ہے اور انھیں لازوال بنا دیتی ہے۔

ایسے جہاں میں رہنا۔ اے گمشدہ دوست! تم کیونکر برداشت کر سکتے ہو۔ مدہوشی کی اُس پٹی کو جس نے تمھاری آنکھوں کو قوتِ بصارت سے محروم کر رکھا ہے تم کیوں نہیں اُتار کر پھینک دیتے؟ کیوں نہیں رضوان سے بآوازِ بلند کہہ دیتے، کہ اے رضوان! اب حد ہو چکی۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میں یہاں ایک پل بھی نہیں ٹھہر سکتا۔

کیوں نہیں تم رضوان کو اپنا آخری فیصلہ سنا دیتے اور کہتے کہ، اے رضوان! اب دیر نہ کرو، دروازے کھولدو میں اپنی دُنیا میں واپس جانا چاہتا ہوں جہاں کشمکش ہے۔ صعوبتیں ہیں۔ نالہ و فغاں ہے۔ جہاں دل کی دنیا بستی ہے، بس کر اُجڑتی ہے اور پھر کبھی آباد نہیں ہوتی۔ جہاں بے زبان جانداروں کے لئے صیاد ہیں۔ جہاں آشیانوں کے لئے بجلیاں اور آندھیاں ہیں۔ یہی دنیا مجھے بلا رہی ہے۔ اسی دنیا میں میں پہونچنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس بات کی مطلق پروا نہیں کہ اتنا عرصہ وہاں میری عدم موجودگی نے لوگوں کو میرے لئے بے قرار نہیں کیا اور کسی کو انتظار کی گھڑیاں نہیں گنوائیں، میں صرف بیداری کی زندگی چاہتا ہوں۔ رضوان! خواہ وہ گمنام ہی ہو۔ میں ایسی زندگی پر دائمی آسایش کی ہزار زندگیاں قربان کرنے کے لئے طیار ہوں اور ایسی زندگی مجھے اُسی دُنیا میں میسر آسکتی ہے"۔

میرے قلم کی نوک ٹوٹ گئی۔ میرا جسم بھی خستہ ہو چکا تھا۔ اب اس سے آگے لکھنے کی مجھ میں قوت ہی باقی نہ رہی تھی۔ میرا سر منوں وزنی ہو گیا اور دفعتاً سُرخ بالوں والی ساحرہ کی تصویر جاگزا۔ میرا جسم پھڑک رہا تھا گویا کہ اس کا ذرہ ذرہ درد سے بیتاب ہے۔ اسی عالم میں میری زبان سے یہ الفاظ نکلے :-

"کہو! خط پسند آیا؟"

مگر وہاں جواب کون دیتا!

جس نے مجھے خط لکھنے پر آمادہ کیا تھا اور جس سے جواب کی توقع کی جا سکتی تھی اُسی کا خون تو ان سطروں میں صرف ہوا تھا۔

انور اعجاز قیصر

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ - نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے - اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حُسن بیان، قدرتِ بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی اور معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے - قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

"گاہے گاہے باز خواں ——"

کیا اسلام اور شریعت ایک چیز ہیں

اس وقت جبکہ پاکستان میں وہاں کے دستور کو قرآن و سنت کے مطابق بنائے جانے کا خیال پیدا ہوا ہے، یہ اصولی بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ کیا اسلام و شریعت دونوں ایک چیز ہیں یا ان کا مفہوم جداگانہ ہے اور اگر یہ ایک ہیں تو کیوں اور مختلف ہیں تو ان دونوں میں باہم کیا تعلق ہے۔

آپ جس چیز کو لفظ شریعت سے تعبیر کرتے ہیں وہ فی الحقیقت فقہ اسلامی ہے اور آپ نہیں اکثر مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ فقہ اور مذہب اسلام دونوں ایک چیز ہیں اس لئے آیئے سب سے پہلے میں آپ کو بتاؤں کہ فقہ کی حقیقت کیا ہے؟

اس میں کلام نہیں کہ شریعت یا فقہ نام ہے اس مجموعۂ قوانین کا جو مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور تمدنی زندگی پر حاوی ہے جس کی حدود سے ان کی انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو بچا ہوا نہیں ہے لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ ہمارے اسلاف جو قوانین وضع کر گئے ہیں ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں یا یہ کہ ان سے ہٹنا مذہب اسلام سے ہٹ جانا ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس زمانہ میں فقہ کے مفہوم کو جو اتنی اہمیت دیدی گئی ہے وہ ابتدائے عہدِ اسلام میں مفقود تھی۔

اگر آپ نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرونِ اولیٰ میں فقہ کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور چیز بھی پائی جاتی تھی جس کا اصطلاحی نام علم تھا اور جو فقہ سے بالکل جدا حیثیت رکھتی تھی۔

علم سے مراد قرآن و تفسیر کا علم تھا اور ان روایات کا جو رسول اللہ اور صحابہ سے منسوب کی جاتی تھیں لیکن فقہ سے (جیسا کہ اسکے لغوی معنی سے ظاہر ہے) مراد عقل و رائے کے بعد کسی نتیجہ تک پہونچنا تھا اسی لئے کبھی کبھی الفاظ فقہ اور رائے مترادف حیثیت سے استعمال کئے جاتے تھے غرض علم اور فقہ دو بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں تھیں اور اسی بناء پر مجاہد نے (من یوتی الحکمۃ) کی تفسیر میں ظاہر کیا ہے کہ صاحب حکمت سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن، علم اور فقہ کا ماہر ہو۔

ہارون الرشید اپنے گورنر ہرثمہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ "اولوا الفقہ فی الدین" اور "اولوا العلم بکتاب اللہ" سے مشورہ کرتا رہے الغرض علم اور فقیہ دو بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور اسی بناء پر ابن عمر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جید الحدیث تھے، لیکن "جید الفقہ" نہ تھے اور ابن عباس فقہ و علم دونوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے، بالفاظ دیگر گویا یوں سمجھئے کہ عالم وہ شخص کہلاتا ہے جسے صرف قرآن اور روایات کا علم ہو اور فقیہ وہ کہلاتا ہے جو جدید مسایل میں غور و فکر کے بعد خود اپنی رائے سے کام لے کر کوئی فیصلہ کرے۔

جب اسلام بالکل ابتدائی دور سے گزر کر ارتقاء کی دوسری منزل میں آیا اور فتوحات کی وسعت کے ساتھ اسے غیر قوموں کے تمدن اور نئے مسایل سے واسطہ پڑا تو بہت سی باتیں ایسی نظر آئیں جن کا ذکر نہ کلام مجید میں تھا نہ رسول اللہ کے اقوال میں اس لئے جن علماء کو عدل و انصاف کی خدمت سپرد کی گئی تھی وہ اپنی عقل و رائے سے کام لیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو علم و رائے دونوں مل جائیں، اسی کا نام "تفقہ فی الدین" تھا اور جو اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہوتا تھا اسی کو سب سے بڑا فقیہ سمجھا جاتا تھا۔ الغرض شریعت اسلامی میں جو مرتبہ قرآن و حدیث کا تھا وہی بلکہ اس سے زیادہ رائے کا تھا کیونکہ بغیر اس کے کام چلنا دشوار ہو جاتا۔ ایکبار امیر معاویہ نے جناب زید بن ثابت سے

کسی امر میں قانونی مشورہ کیا لیکن "فلم یوجد عندہ او عندہم فیہا علم"، نہ وہ کوئی روایت پیش کر سکے نہ دیگر حضرات، آخر کار امیر معاویہ نے اپنی ذاتی رائے سے فیصلہ کیا۔ ایک بار مصر کے قاضی نے خلیفہ عمر ثانی سے کسی معاملہ کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھ تک اس باب میں کوئی روایت نہیں پہونچی اس لئے خود اپنی رائے سے کام لے کر فیصلہ کر دو۔

بنو امیہ کے زمانہ تک باقاعدہ تنظیم شریعت نہ ہو سکی تھی لیکن بنو عباس کے دور میں البتہ قانون سازی کی ابتدا ہوئی اور اس کے چار اصول مقرر کئے گئے قرآن، سنت، قیاس اور اجماع۔ چنانچہ ان اصول پر فقہ اہل سنت کی جو کتاب سب سے پہلے مرتب کی گئی وہ مالک ابن انس کی موطا ہے، اس وقت علاوہ مدینہ کے شام، عراق اور ہسپانیہ میں بھی مختلف حضرات اپنی اپنی فقہ مرتب کر رہے تھے لیکن سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت موطا ہی کو حاصل ہوئی اس کے بعد عراق کی رائج کردہ فقہ کو حماد بن سلیمان نے سنبھالا اور پھر ابو حنیفہ نے اس کو چار چاند لگا دئے اور بعد کو ان کے دو شاگرد ابو یوسف اور محمد کی خدمات تدوین شریعت میں بہت مقبول ہوئیں اور انھیں کی مرتب کردہ فقہ پر آج کل اہل سنت عمل کر رہے ہیں۔

یہ تھا نہایت مختصر سا بیان تدوین فقہ کی تاریخ کا لیکن اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ مسایل شریعت میں تمام مسلم جماعتوں کا اتفاق کبھی نہیں ہوا اور ٹھیک اسی وقت جبکہ قیاس و رائے سے کام لے کر قوانین و قواعد مرتب ہو رہے تھے ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اس کی سخت مخالف تھی اور وہ کہتی تھی کہ قرآن و حدیث میں کیا چیز نہیں ہے کہ ہمکو قیاس و رائے سے کام لینا پڑے۔ بعد کو یہ اختلاف برابر بڑھتا ہی گیا اور کبھی کوئی ایسی شریعت قایم نہ ہو سکی جس پر تمام سنیوں نے بھی اتفاق کیا ہو چہ جائیکہ شیعہ اور خوارج وغیرہ کہ اگر ان کو بھی لے لیا جائے تو پھر اختلاف کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

اس بیان سے دو باتیں واضح ہو گئیں ایک یہ کہ جس چیز کو شریعت اسلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ کوئی منصوص چیز نہیں ہے یعنی نہ خدا کی نازل کی ہوئی چیز ہے اور نہ رسول اللہ کی بنائی ہوئی اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں میں کبھی کوئی ایسی شریعت نہیں پائی گئی جس پر بالاتفاق سب کا عمل رہا ہو۔ اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ آپ کا یہ دعویٰ کرنا کہ شریعت یا فقہ میں تغیر و تبدل کو راہ دینا اسلام کو خراب کرنا ہے کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔

اس بحث میں آپ لوگ اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں کہ دین و مذہب دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، دین سے مراد وہ اصولی عقاید ہیں جو تمام افراد میں جزو مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ مثلاً یہ کہ خدا ایک ہے اور محمد اس کے رسول ہیں لیکن اسکے علاوہ جو کچھ ہے وہ مذہب ہے اگر اس میں اختلاف بھی ہو تو اس کا اثر "وحدت فی الدین" پر نہیں پڑتا۔ اور اسی بناء پر ایک زمانہ سے یہ کہتا چلا آرہا ہوں کہ شیعہ، سنی کے جھگڑے دین سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور ان کا تعلق ان مسایل سے ہے جو ہماری دینی مرکزیت یا اسلامی اشتراک پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

مذہب جس میں ہمارے سیاسی، معاشرتی اور تمدنی قوانین سب شامل ہیں کبھی متفق علیہ چیز نہیں ہو سکتا اور نہ ایک جگہ قایم رہنے والی چیز ہے کیونکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہمارے تمدن، ہماری معاشرت، ہمارے عادات و اطوار اور ہماری ضروریات میں تغیر ہونا ضروری ہے اور تہذیب یا کلچر کے اس تغیر کے ساتھ ہمارے اجتماعی نظام کا بدلنا بھی لازم ہے، چنانچہ آپ دیکھئے کہ آج خود ہمارے علماء کرام کی تہذیب و معاشرت کیا ہی کیا یہ بالکل وہی ہے جو عہد رسالت و خلافت میں پائی جاتی تھی۔ اگر نہیں ہے تو آپ ان سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے شریعت کی پابندی نہیں کی کیونکہ قانون اسلامی میں ہمارے لباس وغیرہ بھی شامل ہیں۔

اس سے تو آپ کو انکار نہ ہوگا کہ علوم و فنون کی ترقی نے اس وقت زمان و مکان دونوں کے مفہوم کو بدل دیا ہے اور تجارت نے ہر ملک و قوم کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زندگی کے مشاغل بہت وسیع ہو گئے ہیں اور ایسے ایسے مسایل ہمارے سامنے آگئے ہیں جن کا اب سے قبل وجود تو خیر کیا وہم و گمان بھی نہ تھا، ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ کے بعد ہی معاشرت کی گتھیاں سلجھانے میں لوگوں کو قرآن و حدیث سے ہٹ کر قیاس و رائے سے کام لینے کی ضرورت پڑی تو اب کہ زمانہ اتنی ترقی کر چکا ہے اور ہزاروں نئی باتیں پیدا ہو گئی ہیں، ہم قیاس و رائے سے

ع نظر کر سکتے اور وہ شریعت جو اب سے صدیوں سال قبل مرتب ہوئی تھی، وہ ہماری موجودہ زندگی میں کیا کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ قانون اقوام کی زندگی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اگر کسی مذہب میں اتنا لوچ نہیں ہے کہ وہ ضروریات ملک وملت کے لحاظ سے اپنے اندر تبدیلی پیدا وہ قطعاً بے روح مذہب ہے اور زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رہ سکتا۔ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ شریعت میں تبدیلی کی ضرورت ہے تو کوئی نئی ں کہتا بلکہ اسی مطالبہ کا اعادہ کرتا ہوں جو قرون اولیٰ میں اکابر دین کی طرف سے کیا گیا تھا اور جس کا نتیجہ آپ کی موجودہ شریعت ہے ظاہر ہے کہ سرزمین عرب میں جو قوانین مرتب کئے گئے تھے ان میں وہیں کی آبادی اور اسی زمانہ کے مقامی ماحول کو پیش نظر رکھا گیا ہوگا آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آج چین میں بیٹھکر لندن کے لئے قانون وضع کیا جائے اور لندن میں بیٹھکر چین کا۔ یا یہ کہ اس وقت ہم کوئی ایسی ت مرتب کردیں جو ہزار سال بعد بھی کام دے سکے۔ پھر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت فقہ حنفی تیار ہوئی ہے اس وقت اہل عرب کو اس کا حصل تھا کہ ایک وقت ہندوستان میں بھی اسلام پھیلے گا اور ان کو اپنی ملکی ضروریات کے لحاظ سے فلاں فلاں امور میں رشد وہدایت کی ضرورت ہوگی یقیناً نہیں۔ پھر آپ کیونکہ اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ شریعت اسلامی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی اتنی ہی مفید و کارآمد ثابت ہے جتنی اب سے سیکڑوں سال قبل عرب کے باشندوں کے لئے تھی اور اس میں اب کسی تغیر و تبدل کی گنجایش نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک بتہ قابل غور ہے اور وہ بھی ان لوگوں کے لئے جو بہت زیادہ قدامت پرست ہیں، وہ یہ کہ فقہ اسلامی ہیں بعض مسایل ایسے ہیں جس کی صراحت جید میں موجود نہیں، بعض احادیث سے لئے گئے ہیں اور بعض قیاس ورائے سے کام لیکر اجتہاد کئے گئے ہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں یل مذکور ہیں ان کو جوں کا توں رہنے دیا جائے اور وہ ایسے ہیں بھی نہیں جن میں تغیر کی ضرورت زیادہ محسوس کی جائے، لیکن احادیث و قیاس سے جو حصہ فقہ اسلامی کا مرتب ہوا ہے، اس کو بدلا جا سکتا ہے اگر اس کی ضرورت محسوس ہو۔ ایسا کرنے سے اصل دین کو کوئی صدمہ نہیں پہونچ یونکہ قرون اولیٰ میں بھی برابر اسی اصول پر عملدرآمد ہو رہا ہے اور اس کو سامنے رکھے بغیر شریعت اسلامی ہر زمانہ اور ہر ملک کے ضروریات کا نہیں دے سکتی۔ رہا یہ سمجھنا کہ اب سے ایک ہزار سال کا انسان تو اجتہاد سے کام لے سکتا تھا اور اب اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ سو اس بجز اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ایسا سمجھنے والے کے سامنے بیل گاڑی اور ہوائی جہاز دونوں کو پیش کر کے خاموش ہو جاؤں۔

"نگار" کے فایل

ء ۳۳ء لغایۃ ۵۲ء کے مکمل مجلد فایلوں
صرف ایک ایک جلد موجود ہے۔ قیمت ۳۳ء
تہ ۴۲ء ۱۵ء و ۲۳ء لغایۃ ۵۲ء ۱۰ء
جلد یکمشت خریدار کو ۲۵ء فی صدی رعایت۔

باسط رضا
نیپال گنج - بہرائچ

تین کتابیں ایک ساتھ

رعایتی قیمت پر

شہوانیات	قول فیصل	گوہر
للعہ	عاء	عہ

صرف چھ روپیہ میں معہ محصول مل سکتی ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

میرے ایک موہوم منش لیکن نہایت خوش ذوق دوست کی بیوی کا انتقال ہوگیا، میں نے انھیں مشورہ دیا کہ فکر نہ کیجئے آپ دوسری شادی کریں گے اور کرلینا بھی چاہئے، انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ "محبت پر یہ ظلم مجھ سے گوارا نہ ہوگا" میں خاموش ہوگیا، کچھ عرصہ کے بعد جب یہ غم محو ہوگیا تو دوسری شادی کرلی اور ایسے زبردست ولولۂ شباب کے ساتھ کہ میر و درد کی دنیا سے ہٹ کر وہ داغ و ریاض کی دنیا میں آگئے۔ انھوں نے مجھے ایک بڑا نشاط انگیز و پر لطف خط لکھا۔ میرا یہ خط اسی کا جواب ہے۔ نیاز

آپ کا خط مجھے اس وقت ملا جب میں اس کی طرف سے قطعاً مایوس ہوچکا تھا اور اپنی اس مایوسی پر مطمئن بھی تھا کیونکہ جب ایک شخص زندگی کے اس دور سے گزر رہا ہو

جہانے مختصر خواہم کہ در روے ہمیں جائے من و جائے تو باشد کہتے ہیں

تو ایسے وقت میں اس کو چھیڑا ہی کیوں جائے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں نے بالکل بے محل تقاضۂ جواب کیا ہے اور اگر آپ اب بھی خاموش رہتے تو میں کبھی آپ کو ملامت نہ کرتا، کیونکہ نتیجہ معلوم

آپ کی اس تحریر کو پڑھکر اپنی اور دوسروں کی زندگی کے بہت سے وہ تجربات سامنے آگئے جن کا اگر تجزیہ کیا جائے تو "فریب نفس" سے زیادہ اور کچھ نہیں ٹھہرتے۔ انسان اور خصوصیت کے ساتھ ایک پڑھے لکھے ذہین انسان کی یہ خصوصیت کہ وہ معصیت کے باب میں بھی "اطمینانِ ضمیر" کی کوشش سے باز نہیں آتا، گو خالص مذہب کی پیداوار ہے، لیکن ہے نہایت پُر لطف۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں کیوں اسے "پُر لطف" کہتا ہوں؟ اس لئے نہیں کہ گناہ کو "صواب" سمجھ کر کرنا کوئی معقول بات ہے بلکہ صرف اس لئے کہ اس طرح "ارتکاب گناہ" میں جو ایک کیفیت "دزدیدہ نگاہی" کی پائی جاتی ہے وہ بڑی لطیف چیز ہے۔ خیر، یہ تو میں نے اس لئے لکھدیا کہ آپ پر اس وقت مجھے معلوم نہیں کیوں، تھوڑا سا رشک آگیا ورنہ میں کہ اب گناہ کو "گناہ" سمجھ کر کرنے کا عادی ہوں اور وہ بھی پوری طرح ضمیر کا خون کرنے کے بعد۔ اب اس قسم کی لذتوں سے اس حد تک بیگانہ ہوچکا ہوں کہ سوا اپنے سب کو "گناہگار" سمجھنے لگا ہوں

مرد و عورت کے تعلقات جنسی کے سلسلہ میں سب سے زیادہ غیر شاعرانہ چیز شادی یا نکاح ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس وقت جب اس میں "مولویت" بھی شامل ہو کہ اس صورت میں تو وہ بالکل بازار کا سا سودا ہوکر رہ جاتی ہے یونتو ایک رنڈی کی بیوی بھی عورت ہونے کے لحاظ سے کوئی خاص چیز نہیں، تاہم بہ لحاظِ احترام رنڈی وہ اس کو محبوب سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا ہے، لیکن ایک مولوی جو اپنی بیوی سے بجز اس کے کہ کوئی توقع نہیں رکھتا کہ نماز سے جو وقت بچے وہ شوہر کی خدمت میں صرف ہونا چاہئے کیا خاک اس کی قدر کرسکتا ہے اگر اولاد ہونے سے قبل وہ مرجاتی ہے تو ایک خادمہ کے چلے جانے کا رنج ہوتا ہے اور اولاد چھوڑ گئی تو ایک دایہ و مرضعہ کی حیثیت سے اس کے اُٹھ جانے کی تکلیف ہوتی ہے

ہر چند مولوی نہ ہونا رنڈ ہونا نہیں ہے، لیکن جو رنڈ نہیں ہے وہ مولوی یقیناً ہے، اسی حیثیت سے میں آپ کو مولوی سمجھتا ہوں، اور اسی بنا پر میں نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ فوراً عقد کرلیجئے کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ صدمہ و تاثر جس کا تعلق

ں بلکہ "بچوں کی ماں" کے اُٹھ جانے سے ہے بالکل عارضی چیز ہے اور ہمیشہ اس کا مداوا "نکاح ثانی" سے کیا جاتا ہے خواہ وہ ثابت ہو یا ناکام

آپ نے اس کا جواب ایک ایسی "رندانہ خودسری" سے دیا کہ جی خوش ہوگیا، حالانکہ اس پر عزم و ثبات کا زیادہ یقین مجھے نہ ، زمانہ گزر گیا اور میں یہی سمجھتا رہا کہ ممکن ہے آپ کی سوگواریاں بدستور قایم ہوں، لیکن حال میں آپ کی تحریر نے اس پردہ کو ا دیا اور مجھے یہ سُن کر کہ آپ نے دوسری شادی کرلی اطمینان بھی ہوا اور حیرت بھی ہوئی، اطمینان اس لئے کہ یہ زمانہ "عشق و لے لئے سازگار ہی نہیں، گو آپ کی عمر اس کی مقتضی ہو اور حیرت اس لئے کہ آپ کے لب و لہجہ سے یہ بھی مترشح ہوتا تھا کہ یہ ح ہی نہیں ہے بلکہ رومان بھی ہے۔

میں نے آپ کو اس "نشاط تازہ" پر مبارکباد دی، لیکن آپ نے غالباً اس میں کچھ طعن بھی محسوس کیا اور اس کے جواب میں اور پس و پیش کے بعد ایک "انتقاد نامہ" روانہ فرمایا

یاد رکھیئے کہ آپ کے نکاح ثانی سے جتنی مجھے خوشی ہوئی کسی اور کو نہیں ہوسکتی، کیونکہ میں اس کی پیشین گوئی کرچکا تھا، آپ کو ے چکا تھا اور حقیقتاً آپ کے لئے ضروری بھی جانتا تھا۔

آپ نے اپنی موجودہ حیات ازدواج کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے ہر چند اُن سے ایک خاص قسم کا نشہ ضرور ٹپکتا ہے لیکن میں لرتا ہوں کہ اس میں کچھ "اندیشۂ نیش" بھی شامل ہے۔ اگر پہلی بیوی کے انتقال کے بعد اتنا زمانہ حسرت و یاس میں بسر لاف عقل تھا تو اب نکاح ثانی کے بعد اس کی خلش کو باقی رہنے دینا اس سے زیادہ بُرا ہے۔ آپ کی زندگی کے پہلے حصہ دوسری بیوی شریک نہ تھی تو دوسرے حصہ میں پہلی بیوی کیوں شامل ہو۔ کیا آپ اپنے دو ٹکڑے برابر کے ایسے نہیں کرسکتے ں کمی بیشی کا سوال ہی نہ پیدا ہوسکے

ہر چند آپ نے وضاحت کے ساتھ تو نہیں لیکن اجمالاً ضرور اس تفاوت کو ظاہر کیا ہے جو آپ کی اور اُن کی عمر میں پایا اس کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ایسی صورت میں دلداریوں کی ذمہ داری زیادہ تر آپ ہی پر عاید اس میں شک نہیں کہ :۔ "غنچہ تا شگفتنہا قدر عافیت معلوم!" کا احساس نہایت تکلیف دہ ہے، لیکن کے باب میں اس کا تشائم پہلو بھی عورت ہی کے احساس سے تعلق رکھتا ہے، کیونکہ مرد اپنی کمزوریوں کے چھپانے رکھتا ہے اور اس حد تک جری واقع ہوا ہے کہ اگر پھول کی خوشبو اس کو محسوس نہ ہوگی تو غصہ میں آکر اس کو "بے بو" ں ڈالے گا اور اپنے ضعف شامہ کو کبھی نہ ظاہر ہونے دے گا — آہ، آپ کیا پوچھتے ہیں کہ ہندوستان کی عورت لوم ہے۔ اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کا خون بھی کرے اور مسکراتی بھی رہے!

اور کیجئے کہ اس جدید تعلق سے جو تغیر آپ کے جذبات میں پیدا ہوا ہے اس کو معلوم کرکے میں خوش ہوا، اس لئے نہیں کہ بجائے میر و درد کے داغ و ریاض کی دنیا میں آگئے ہیں، بلکہ صرف اس بنا پر کہ سنِ وقوف میں ——— ئلے شود مستانہ می رقص" — اس بات کی علامت ہے کہ انسان زیادہ زندہ رہنا چاہتا ہے اور یہ آپ جانتے ہیں کہ میں زکم اس وقت تک ضرور زندہ رکھنا چاہتا ہوں جب تک میں موت کے خیال کو بھلائے ہوئے ہوں

یہ درست ہے کہ "انسان کا ہر حال خواہ وہ غم آگیں ہو یا طرب انگیز اس کی ناپایداری مسلم ہے" لیکن سوال انسان اس فکر میں اپنا سر کیوں کھپائے۔ طلوعِ ماہ کی طرف سے آنکھیں بند کرلینا صرف اس لئے کہ اسے ی ہونا ہے یقیناً کوئی فطری مطالبہ نہیں۔ غالب نے اس فلسفہ کو ایک نہایت لطیف و نازک طنزیاتی پیرایہ میں ں بیان کیا ہے :۔

حرفِ مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز
دُعا قبول ہو تارب کہ عمر خضر دراز

انسان خواہ کتنی ہی عمر لیکر آئے لیکن وہ زندہ رہتا ہے زیادہ سے زیادہ پندرہ سال ۔ بیس سے پینتیس تک پھر فطرت کے اس بُخل سے انتقام لینے کی صورت یہی ہے کہ اس کی طرف سے یکسر روگردانی اختیار کرلی جائے ۔ " القارعۃ " پڑھ پڑھ کر آنسو بہاتے رہیئے اور " اذازلزلت الارض زلزالہا " کے خیال سے کانپتے رہنے کی عمر ابھی آپ کی نہیں آئی ہے اور پھر یوں بھی طاعت و عبادت یا حسن اخلاق کا یہ مفہوم میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ خدا کو نعوذ باللہ " بیجا " سمجھ لیا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا خدا صرف " رحمان و رحیم " ہے، میں شراب پیتا ہوں وہ مسکراکر منھ پھیر لیتا ہے، میں بدمستی کرتا ہوں وہ ٹال جاتا ہے، میں جتنا اس کی طرف سے بے پروا رہتا ہوں اتنی ہی زیادہ پرواہ وہ میری کرتا ہے

او خود مگر بہ لطف خداوندئ کند
ورنہ زما چہ بندگی آید پسند او

آپ نمازیں پڑھئے لیکن نماز کا " سوگ " اپنے اوپر کبھی نہ طاری ہونے دیجئے ۔ آپ جتنی زیادہ نماز پڑھتے ہیں اتنا ہی زیادہ حق آپ کو خدا کے بھلا دینے کا حاصل ہے ۔ خدا کو بُھلا دینے کے معنے اس کے قہر و غضب سے مطمئن ہوجانے کے ہیں ۔ آپ داڑھی بڑھائیے لیکن صرف چہرہ پر، سینہ کے اندر نہیں کہ اس کی سیاہی قلب پر چھا جائے ۔ خیر تو مدعا یہ کہنا تھا کہ جب ہر چیز کی ناپایداری مسلّم ہے تو مسرت کی گھڑیوں کو فکر غم سے تباہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے ۔ اس لئے شبِ وصل کی شوخیوں کا ذکر کرتے ہوئے " غمکدہ اور آہ " کو یاد کرنا مجھے پسند نہیں آیا ۔ چونکہ آپ پر کبھی رندی کا دور نہیں آیا اس لئے آپ " رندانہ اخلاق " کی بلندی سے بھی واقف نہیں، میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں رندی کی ابتدا ہوتی ہے اپنے آپ کو بھلا دینے سے اور اس کا اختتام ہوتا ہے اپنے آپ کو مٹا دینے پر دوسروں کے لئے ۔ آپ کو معلوم ہے اس وقت وہ دوسرا کون ہے جو آپ سے اس " رندانہ رواداری " کا طالب ہے ۔ آپ کی بیوی !— اگر میں نے آپ کی موجودہ زندگی کو " بہیئہ نشاط " کہا تو یہ میرا اک نوع کا مشورہ تھا نہ کہ طنز و استہزا — آپ نے کیوں وہ باتیں لکھیں جن کو میں سننا پسند نہیں کرتا ۔ ابھی تو ابتدا ہے، اگر ابھی سے آپ نے کراہنا شروع کیا تو آیندہ کیا کیجئے گا

مسرت کے اسباب پیدا ہوئے ہیں تو ان میں غرق ہوجائیے اپنے لئے نہ سہی کسی اور کے لئے جس کی مسرتیں صرف آپ سے وابستہ ہیں ۔ یہی ہے اصلی رندی اور یہی ہے اُس کی وہ بلندیِ اخلاق جو آپ کو محراب و منبر میں نظر نہیں آسکتی ۔

جہاں نگاہ ہو وہیں دل بھی ہونا چاہئے ——— " دل جائے دیگر ست و نگہ جائے دیگر ست " ——— ہمارے کیش میں حرام ہے ۔ " بہ ہوش باش " مناسب ہے، لیکن صرف اس حد تک کہ " ساغرِ دست مگزاری "

یہاں تک تو خطاب تھا صرف آپ سے اور وہ بھی نصائح کی صورت میں، کیونکہ جانتا ہوں مرد مسلمان ہونے کے لحاظ سے آپ کو نصیحت ہی کی زیادہ ضرورت ہے ۔ لیکن ایک نہایت مختصر سی بات اُن سے بھی کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کی تنہا فتح صرف اس فلسفہ میں پنہاں ہے کہ :-

" عہد تو شکست و من ہمانم ! "

فراست الید جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، فہرست و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے ۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول ۔ منیجر نگار

کوزہ و دریا

خشک کتابیں علم کی پیاس بجھانے میں ہمیشہ کامیاب نہ ہوتیں

بعض آدمی تھکے ہوئے پیدا ہوتے ہیں اور بعض دوسروں کو تھکا دینے والے

مرد زندگی کو "ممکن" بناتا ہے اور عورت اسے "اغلباً" میں تبدیل کر دیتی ہے

اگر تم کوئی غلطی نہیں کر سکتے تو دنیا میں کچھ نہیں کر سکتے

ایک شخص نے پوچھا کہ شہر کا بہترین ٹاکی ہاؤس کون ہے، درانحالیکہ وہ "لیجسلیٹو کونسل" کی عمارت میں بیٹھا ہوا تھا

تماشہ کے درمیانی وقفہ میں ایک مغربی تھیٹر کے منیجر نے آکر تماشائیوں سے کہا کہ باہر دروازہ پر ایک عورت ریوالور لئے کھڑی ہے
کہہ رہی کہ اس کا شوہر دوسری عورت کے ساتھ یہاں بیٹھا ہوا ہے - اگر وہ اس عورت کو چھوڑ کر فوراً باہر نہ آیا تو وہ اسے
ڈالے گی ——— ایک منٹ نہ گزرا تھا کہ سارا تھیٹر ہال خالی تھا

عورت جب کبھی آئینہ دیکھتی ہے تو اسے کوئی نہ کوئی مرد بھی وہاں نظر آتا ہے

اگر کوئی مرد کنویں میں کود پڑے تو سمجھو کہ اس کی تہ میں ضرور کوئی عورت ہے

ایک مقرر دوران تقریر میں کہہ رہا تھا کہ "جو آج لڑکے ہیں وہ کل مرد ہونے والے ہیں" مگر جنس لطیف سے اس کا کوئی
علق نہیں کیونکہ وہاں تو یہ عالم ہے کہ "جو آج عورتیں ہیں وہ کل لڑکیاں بن جائیں گی"

عریاں رہنے والی عورتوں کے ایک کنج میں اتفاقاً کوئی سانپ نظر آگیا تو وہ سب ڈر کر بھاگیں حالانکہ وہ غریب تو اسے باغِ
دن سمجھ کر آیا تھا

ایک موتی سے دانت رکھنے والی عورت کا منہ فطری موزونیت کے لحاظ سے سیپی کی طرح بند رہنا چاہئے

قزاق وہ ہے جو دوسروں کو اپنی معاش کا ذمہ دار قرار دیتا ہے

اکثر عورتیں آئینہ کے سامنے گھنٹوں صرف کیا کرتی ہیں، اس کا سبب پندار نہیں بلکہ تصور ہے

احمقوں کی بے وقوفیاں، صاحبانِ عقل کی دانشمندیوں سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں -

شاعر پیدا ہوتا ہے - اسی لئے اس کا علاج ممکن نہیں

ایک واعظ نے دوران تقریر میں کہا کہ "مجھے بتاؤ خدا کہاں نہیں ہے" غالباً اس وقت اُس کا خیال مندر، مسجد اور کلیسہ
لی طرف ہوگا

عورت کو دُنیا سے علیحدہ کر دو، اس کے بعد مرد کی مشکلات کو تمھیں "خوردبین" سے دیکھنا پڑے گا۔ نیاز

دعوتِ نقد و نظر

(پروفیسر عطاء الرحمان)

"نگار میں اس سلسلہ کو قایم کرکے آپ نے شعر و ادب کی بڑی اہم ضرورت کو پورا کیا۔ اس دور بے راہ روی میں اگر ادبی احتساب نہ کیا جائے تو ہر گناہ ثواب بنتا جائے گا۔ اکثر ناحق غلطیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں اور اگر اسکی طرف توجہ نہ کی جائے تو وہی سند پکڑ لیتی ہیں ضرورت ہے کہ ارباب نقد و نظر سلامت روی اور بے تعصبی سے نرم لب و لہجہ میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔ آپ نے جن اشعار کو پیش کرکے دعوت نقد و نظر دی ہے، ان پر اپنی بساط فہم و درک کے مطابق رائے پیش کرتا ہوں۔ (عطا)"

(۱) کچھ داغِ دل سے تھی مجھے امید عشق میں — سو رفتہ رفتہ وہ بھی چراغِ سحر ہوا

چراغِ سحر خلاف محاورہ ہے۔ چراغِ سحری ہونا چاہئے۔

(۲) اِدھر جوشِ مستی، اُدھر چشمِ شوق — مصیبت میں بندِ نقاب آگیا

پہلے مصرعہ میں اِدھر اُدھر کی ترتیب غلط ہے۔ دوسرے مصیبت میں آنا خلاف روزمرہ ہے۔ مصیبت میں پڑنا چاہئے تیسرے مصیبت سے بہتر لفظ کشاکش ہوتا۔ مصیبت اس وقت ہوتی جب اس طرف جوشِ حیا پایا جاتا۔

(۳) پردہ رکھنا تھا جو منظور تو عاشق کے لئے — دامنِ یار کو لازم تھا گریباں ہونا

مفہوم گنجلک ہے، اس سے تو اور پردہ دری کا ساماں ہوتا

(۴) سُن کے افسانۂ غم باغ میں کمھلا گئے پھول — شاق گزرا مجھے بلبل کا غزل خواں ہونا

"مجھے شاق گزرا" کی ترکیب درست نہیں۔ مجھ پر شاق گزرا ہونا چاہئے۔

(۵) چاہئے عشق میں مجھے آپ ہی کا جمال سا — داغ ہر ایک بدر سا، زخم ہر ایک ہلال سا

پہلے مصرع میں "آپ ہی کا سا جمال ہونا چاہئے"۔ دوسرے بدر داغدار ہونا ہے خود داغ نہیں ہوتا تیسرے "ہر ایک ہلال" کی جگہ "ہر ایک" ہونا چاہئے ورنہ شعر ناموزوں ہو جائے گا۔ دیوان میں بھی "ہر ایک" ہی ہے۔

(۶) نگہِ شوق نے سب کھول دئے بندِ نقاب — سہل سمجھے تھے وہ پابندِ حیا ہو جانا

پہلے مصرعہ میں ہلکی سی تعقید لفظی ہے مگر خیر مضایقہ نہیں دوسرے مصرعہ میں ترکیب کا تقاضہ یہ تھا کہ پابندِ حیا ہو جانے کو وہ سہل سمجھے تھے نہ کہ پابندِ حیا ہو جانا سہل سمجھے تھے۔

(۷) ہر وقت اک خمار تھا ہر دم سرور تھا — بوتل بغل میں تھی کہ دلِ ناصبور تھا

دلِ ناصبور کو بوتل سمجھ کر خمار و سرور میں رہنا مستبعد ہے۔

(۸) جس دل کو تم نے لطف سے اپنا بنا لیا — اس دل میں اک چھپا ہوا نشتر ضرور تھا

اول تو "تھا" کی ردیف نامناسب ہے۔ دوسرے نشتر، آلۂ زخم ساز کو کہتے ہیں نہ کہ خود زخم کو یہاں مفہوم زخم کا ہے نہ کہ نشتر کا۔

(۹) دل نہ تھا جان نہ تھی سوز نہ تھا، ساز نہ تھا — میں ہی میں تھا مرے ہمراہ کوئی راز نہ تھا

راز کا ہمراہ ہونا بے معنی ہے۔

(۱۰) بہت روکا تمہارے وعدۂ دیدار نے ورنہ — وہاں ہوتی نہ میری بے خودی بھی میں جہاں ہوتا

پہلے مصرعہ سے دوسرے مصرعہ کو کوئی ربط نظر نہیں آتا۔

(۱۱) خلوت میں غم فرقت اس طرح بیاں ہوتا — وہ میری زباں بنتے میں ان کی زباں ہوتا

غم فرقت کا احساس دونوں جانب ہونے کے باوجود ایک کا زبان بن جانا اور دوسرے کا زبان ہو جانا تعجب انگیز ہے۔

(۱۲) تھی سیر اگر میں بھی ساتھ انکے وہاں ہوتا — آنسو بھی رواں ہوتے دریا بھی رواں ہوتا

"وہاں ہوتا" سے مراد اگر سیر دریا ہے تو پھر ان کی معیت میں آنسو کی روانی یہ کیا ؟

(۱۳) جنوں میں سینے کو بیٹھے ہیں جیب کے ٹکڑے — خبر نہیں کہ گریباں بھی تار تار ہوا

شاعر نے جیب و گریباں کو دو الگ چیز تصور کر لیا ہے حالانکہ دونوں ایک ہی ہیں۔

(۱۴) زخم کو مرہم دل درد کو درماں سمجھا — چارہ گر خوب علاج غم پنہاں سمجھا

پہلے مصرعہ میں دل کا لفظ بیکار ہے اور دوسرے مصرعہ میں علاج سمجھا غلط ہے۔

(۱۵) عشق کا راز وہی سوختہ ساماں سمجھا — جس نے دامن کبھی جانا نہ گریباں سمجھا

صحیح زبان یہ ہوگی کہ "جس نے نہ دامن کو دامن جانا اور نہ گریباں کو گریباں"

(۱۶) تھا کھیل سا پہلے عشق لیکن جو کھلیں آنکھیں — ڈوبا ہوا رگ رگ میں وہ تیر نظر دیکھا

عشق کا "ق" گرتا ہے۔ "وہ تیر نظر" کی بجائے اس کا تیر نظر ہونا چاہئے۔

(۱۷) اس چشم غزالیں کو مے خانۂ دل پایا — اس روئے نگاریں کو فردوس نظر دیکھا

غزال سے غزالی درست ہے نہ کہ غزالیں۔ علاوہ اس کے چشم کو مے خانہ کہنا کافی تھا نہ کہ مے خانۂ دل

(۱۸) اے نگاہ یاس یہ کیا رنگ محفل ہو گیا — میں نے جس دل کی طرف دیکھا مرا دل ہو گیا

یعنی ہر طرف مایوسی چھائی ہوئی تھی مگر شاعر نے جس لب و لہجہ سے دوسرا مصرعہ کیا ہے اس سے یہ معنی مستنبط نہیں ہوتے۔

(۱۹) جب تو کچھ ظرف ہے اسے دل ترے پیمانے کا — رازے خانے سے باہر نہ ہوے خانے کا

"جب تو کچھ" کی ترکیب مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے نامناسب ہے

(۲۰) کھلے گا چارہ گر پر راز غم کیا درد کے ہوتے — کہ آتا ہے اسے خود نبض کی رفتار ہو جانا

"درد کے ہوتے" کا ٹکڑا غیر واضح ہے۔ یعنی "درد نہ ہوتا تو راز کھل جاتا" حالانکہ یہ معنی نہیں۔

(۲۱) جس پر برس گئی کبھی برق جمال یار — ہر ذرہ آفتاب ہے اس کے مزار کا

برق کا برسنا خلاف محاورہ ہے۔ دوسرے مفہوم کے اعتبار سے "اس مزار" کا ہونا چاہئے نہ کہ اس کے مزار کا۔

(۲۲) اللہ اللہ یہ کمال جذبۂ پنہان عشق — جو گرا آنکھوں سے آنسو حسن کا دریا ہوا

شاعر کا خیال یہ ہے کہ محبوب کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہوا تو پھر جذبۂ پنہاں کیسا ؟

(۲۳) بڑھتے بڑھتے آفتاب روز محشر بن گیا — دل کی خاکستر میں اک شعلہ تھا جو بھڑکا ہوا

خاکستر میں شعلہ کہاں ؟ شرار ہو سکتا ہے۔

(۲۴) رگ رگ میں دل تھا، دل میں نہاں سوز و ساز تھا — وہ دن بھی کیا تھے جب میں سراپا گداز تھا

"وہ دن بھی کیا تھے" کے ٹکڑے سے تحقیر ظاہر ہوتی ہے نہ کہ تعلی۔

(۲۵) اللہ ری مجبوری آداب محبت — گلشن میں رہے اور گلستاں نہیں دیکھا

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے گلشن اور گلستاں کو دو علیحدہ علیحدہ سمجھا ہے۔ "مجبوری" سے بہتر لفظ "پاس" کا ہوتا "پاس ادب"

(۲۶) شریک نالہ میرا بھی جو انداز فغاں ہوتا — چمن میں ہر لب خاموش بلبل کی زباں ہوتا

نالہ و فغاں دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ پڑھنے میں یہ شعر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے مگر مفہوم کے اعتبار سے کچھ نہیں۔

(نگار) اس سلسلہ میں دیگر حضرات کی رائیں، مارچ ۱۹۵۳ء کے نگار میں شایع ہوں گی، اور اسی کے ساتھ جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ بھی ظاہر کر دوں گا۔ (نیاز)

اعتبارات!

بُڑھیا اور خُدا

"بڑھیا تو کیوں رو رہی ہے"۔ "میرا بچہ بیمار ہے۔ جوان کا اکلوتا بچہ! میری زندگی کا اکیلا سہارا، میرے اُجڑے ہوئے گھر کا تنہا چراغ۔ آہ، وہ بہت بیمار ہے لوگ کہتے ہیں وہ بچے گا نہیں، سچ بتاؤ، کیا واقعی وہ مرجائے گا؟"

—— "نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا، گھبراؤ نہیں، علاج کرو، اچھا ہوجائے گا۔"

—— "علاج! ہاں، علاج تو میں کرچکی جو کچھ میں کرسکتی تھی۔ اس پھٹی ہوئی دھوتی کے علاوہ جو کچھ تھا سب بیچ کر میں اس کے علاج میں لگا چکی، لیکن کوئی فائدہ ہوا"۔ —— "پھر اب کہاں جارہی ہے؟"

—— "مسجد جارہی ہوں، خدا سے التجا کرنے جارہی ہوں، وہی سنے گا اور وہی اس کو اچھا کرے گا۔"

—— "ضرور جاؤ، خدا میں بڑی قدرت ہے وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔"

چند دن بعد بڑھیا یہ کیا بک رہی ہے، خدا کی شان میں ایسی گستاخی!"

"خدا! — کون؟ وہی جس نے میرا اکلوتا بچہ مجھ سے چھین لیا، جو رات دن ناک رگڑوانے کے بعد بھی میری خواہش کو پورا نہ کرسکا۔ جو مُردوں کو جلانے کی قدرت رکھنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود معمولی کھانسی بخار کو دور نہ کرسکا — ہٹ جاؤ میرے سامنے سے، مجھے نہیں معلوم میں کیا کہہ رہی ہوں، میرے سینہ سے دھواں اُٹھتا ہے۔ مجھے نہ چھیڑو — میرے جسم کی رگ رگ ٹوٹی جارہی ہے۔ میرا ریشہ ریشہ اینٹھ رہا ہے — جب میرا بیٹا دُنیا میں نہ رہا تو میں خدا کو لیکر کیا کروں گی!"

—— "بڑھیا، ایسی ناشایستہ باتیں منہ سے نہ نکال، تیرا بیٹا خدا کی امانت تھی، اس نے واپس لے لی، اس میں بُرا ماننے کی کیا بات!"

—— "خدا کی امانت تھی! بالکل جھوٹ؟ جب اس کا باپ چھوٹا سا چھوڑ کر مرا تو کیا خدا نے اس کو آکر پالا تھا — کیا جلتی دھوپ میں پتھر توڑ توڑ کر خدا ہی اسکے لئے غذا فراہم کیا کرتا تھا — ہونہہ! — میں نے اپنا خون پلا پلا کر اُسے پالا، میں نے فاقہ کرکر کے اس کا پیٹ بھرا — جب بیمار پڑا تو ساری گھرستی بیچ کر میں نے اس کا علاج کیا، رات رات بھر میں اس کے لئے جاگی۔ اس کی صحت کے لئے میلوں پیدل چل کر میں دوا لائی — خدا نے کیا کیا — وہ میرا بیٹا تھا، میری چیز تھی امانت کیسی!"

—— "معلوم ہوتا ہے تو نے صرف دوا پر بھروسہ کیا۔ خدا سے دُعا نہیں کی؟"

—— "(چیخ کر) ہٹ جاؤ، دور ہو میرے سامنے سے — دعا نہیں کی؟ — اندھو جاؤ، جاکر دیکھو، مسجد کے فرش پر اب بھی میرے آنسوؤں کے دھبے بہت سے موجود ہوں گے — خدا — خدا، کرتے پھرتے ہیں۔ جب دعا کرتے وقت میرا سینہ پھٹتا تھا، تو تم میں سے کوئی میرا ساتھ دینے والا نظر نہ آتا تھا اور اب جو میں دعا نہ سننے والے کو بُرا بھلا کہہ رہی ہوں، تو تم سب کا ئیں کا ئیں کرکے میرے پیچھے پڑے ہو — اگر خدا کسی کی دُعا نہیں سُن سکتا، تو اسے بُرا بھلا سننے کے لئے بھی طیار رہنا چاہئے"

بڑھیا کو پاگل سمجھ کر لوگ چلے گئے، لیکن میں نے یہ سارا واقعہ ایک بڑے دیندار عالم سے بیان کیا، تو انھوں نے کہا "افسوس ہے اسلامی حکومت نہیں، ورنہ اس بڑھیا کو قتل کردیا جاتا —"

ن کر میں نے دل ہی دل میں کہا کہ:۔ "بڑھیا کو تو خیر غم نے دیوانہ بنا دیا تھا اور وہ خدا کے صحیح تصور پر قادر نہ تھی لیکن انھیں کیا ہو گیا ہے
خدا اور دار و رسن !

س خیال پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

ور خدا

شاید میں نے یہ سب کچھ خواب میں سنا:۔

:۔ خدا کا تصور زمان و مکان کی قید کے ساتھ، آئنسٹائن کے فلسفۂ اضافیت کی طرح ہمارے تصور و خیال میں بھی انحناء چاہتا ہے۔
خدا کے ماضی کا تصور ہم طبقات الارض کے ذریعہ سے کرتے ہیں، حال کا تصور اخلاقیات کی وساطت سے اور مستقبل کا مابعد الطبیعیات کے وسیلہ سے!
یب بات ہے! — حالانکہ خالق و مخلوق کے درمیان جو حقیقی رشتہ ہونا چاہئے، اس پر ان باتوں سے مطلق روشنی نہیں پڑتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ
نگاہ جس سے کائنات کے پیدا کرنے والے کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ابھی تک انسان کی سمجھ میں نہیں آیا اور اسی زاویہ کی جستجو انسان کا
ین ہے۔

الم :۔ انحناء۔ طبقات الارض۔ مابعد الطبیعیات۔ زاویۂ نگاہ! — یہ کیا بکواس ہے — !

خدا۔ زبردست قدرت و جبروت والا خدا — جو چاہے کرنے والا اور کسی سے باز پرس نہ کیا جا سکنے والا خدا — بغیر کسی حجت و دلیل کے مانا جانے
— اپنے قہر و غضب سے نافرمان انسان کو آتشِ جہنم میں جلا سکنے والا خدا — اور اگر خوش ہو تو فردوس کی لازول شیرینیوں اور لذتوں سے
لدینے والا خدا — ! کتنا صاف، سادہ اور سلجھا ہوا عقیدہ — مگر تمھاری سمجھ میں نہیں آتا — کتنے بدنصیب انسان ہو — میں
وں کہ جدید زاویۂ نگاہ کی جستجو ہی تمھیں جہنم کے گوشہ میں لے جائے گی۔

:۔ جستجو بُری چیز نہیں۔ لیکن جس طرح مادیات کی جستجو سے خدا نہیں مل سکتا، اسی طرح اُسے ہم فردوس و جہنم میں بھی نہیں پا سکتے۔ خدا نام
ہ اوست" اور "ہمہ از دست" کا۔ مگر اس کا علم "فنا فی الشیخ" کا درجہ حاصل کرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔
جس طرح خدا فلسفی سے بلند ہے، اسی طرح مذہب کی ظاہری قیود سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے۔ قلب پر لا الہ کی ضربیں لگاؤ تا کہ سویدائے
یں لطیفۂ غیبی سے روشنی پیدا ہو اور تم خدا کو دیکھ سکو۔

س داں :۔ میں نہیں سمجھتا کہ خدا کو سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مہربانی کر کے آپ یہاں سے چلے جائیے۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے،
چ رہا تھا کہ فضا میں کون کون سی شعاعیں ایسی موجود ہیں جن سے ہم دشمن کو میلوں دور بیٹھے کہ ہلاک کر سکتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میں
ع قریب قریب دریافت کر لی ہے۔

ناگہاں ایک شخص یہ شعر گنگناتا ہوا ادھر سے گزرا:۔

خدا کو چار دیوارِ حرم میں ڈھونڈنے والے
اِدھر آئیں، ذرا دیکھیں مرے ٹوٹے ہوئے دل کو

میری آنکھ کھل گئی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

نیاز

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی کیا حقیقت ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ
انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔

منیجر نگار لکھنؤ

رقص

(شمیم نیازی)

رقص کیا ہے - دامنِ امکاں پہ نیرنگِ نشاط
رقص کیا ہے - جنبشوں میں داستانِ آرزو
رقص کیا ہے - شوق کا تحلیل ہونا لوچ میں
رقص کیا ہے - نرگسِ مخمور کی بیداریاں
رقص کیا ہے - جلوۂ تقدیس کی بیباکیاں
رقص کیا ہے - پیکرِ حسن و لطافت کی ادا
رقص کیا ہے - ایک نغمہ حسن میں ڈوبا ہوا
عشوہ و ناز و ادا کی شاعرانہ گفتگو
خواہشوں کی بے قراری، ولولوں کا اضطراب
ساغرِ ہستی میں ہے یہ ارتعاشِ موجِ نور

نغمہ و حسن و محبت کا مسلسل ارتباط
نرم و نازک لوچ میں لپٹی ہوئی سی گفتگو،
جوششِ احساسات کا موتی پرونا لوچ میں،
حسنِ خوابیدہ کی لذت کوشیاں ہشیار ہیں،
داستاں کی خامشی یا خامشی کی داستاں
ہوش کے سانچہ میں اک تعلیم پیمانِ وفا
انقلابِ سازِ ہستی کروٹیں لیتا ہوا
یا نگاہِ نیم وا کی ملہمانہ گفتگو،
کسرتِ مینا میں گویا لرزشِ موجِ شراب
یا پیاماتِ الوہیت کا الہامی ظہور،

شاعر کی دُنیا

(اختر انصاری)

وہ گرمیوں میں شبِ مہ کا رنگِ سیمینی
وہ جھوم جھوم کے گھنٹوں برسنے والی گھٹا
وہ نے نواز کے پُرکیف زمزموں کا لوچ
جوانیوں کے چھلکتے ہوئے وہ جامِ شراب
وہ گردنوں کا تناسب وہ ابروؤں کا کھنچاؤ
کسی کے عشق میں وہ نامرادیوں کے مزے
سکوتِ شب میں وہ گزرے ہوئے دلوں کی یاد
وہ عین اٹھتی جوانی میں موت آجانا

وہ برشکال میں شام و سحر کی رنگینی
جو طبعِ مست کو دیتی ہے درسِ بے دینی
وہ نغمہ گر کے رسیلے سُروں کی شیرینی
وہ گیسوؤں کی چمک وہ رخوں کی زرّینی
وہ انکھڑیوں کی گلابی خمار آگینی
وہ نوجوان طبیعت کی یاس آگینی
جو دل کو بخشتی ہے اک لطیف غمگینی
وہ باغِ زیست میں دستِ فنا کی گلچینی،

یہ زندگی کے ہلاکت فروش منظر ہیں
انھیں کے مارے ہوئے کیٹس اور اختر ہیں

رونقِ محفل

(ابن فیض اعظمی)

نشانِ مہرِ افق پر اُبھرتے آتے ہیں
چراغ ذروں کی خلوت میں جلتے جاتے ہیں

سحر تراش چکی روشنی کے افسانے
ہوئے ہیں مرثیہ خواں کس قدر سیہ خانے

لگی ہوئی ہے نظر عرش کی زمیں کی طرف
کہ سنگ ریزوں نے پایا زرو گہر کا شرف

نہا کے نور میں نکھرے ہیں پھر ہمالۂ طور
اندھیرے پھر ہیں دو زانو تجلیوں کے حضور

چھپا رہی تھی جسے تیری کلکِ نکتہ نگار
کئے بصیرتِ آدم نے فاش وہ اسرار

یہ حرف و حکمتِ قرآں، یہ دانشِ جبریل
یہ رازِ سینۂ توریت و نکتۂ انجیل،

جہاں فرشتوں میں جرأت کا شائبہ نہ رہا
یہ غم کا بار گراں لے کے مسکرا اُٹھا

گزر کے سائے کی منزل سے روشنی میں گھرا
یہ آگ لینے گیا اور رسول ہو کے پھرا

فلک کے سینے پہ اک آبلہ تھا پھوٹ گیا
اُٹھائی اس نے جو اُنگلی تو چاند ٹوٹ گیا

حرا میں سیدِ عالم کے روپ میں اُترا
سوادِ دہر کو پیغامِ جاوداں بخشا،

اسی کی آگ میں تپ کر حیات نکھری ہے
اسی کے نور سے یہ چاندرات نکھری ہے

کتابِ دانش و دین و ہنر تمام اس کے
زرِ شفق ہو کہ سیمِ سحر تمام اس کے

یہ بوئے گل کا مہکتا ہوا فسوں، اس کا
تحیر اس کا خرد اس کی اور جنوں اس کا

اسی کی ضو میں مہ و مہر راہ چلتے ہیں
چراغ اسی کے چراغِ ہنر سے جلتے ہیں

یہ چونکتی ہوئی نیل و فرات کی آواز
یہ جھومتا ہوا ساغر یہ جاگتا ہوا ساز

یہ میکدے میں سبو اور چمن میں پھول بنا
کبھی یہ رند بنا اور کبھی رسول بنا،

کبھی دماغ میں سودائے سبحہ و زنار
کبھی مزاج میں خوشبوئے کشت و سبزۂ و یار

ہیں کتنے مہرِ جہانتاب اور اس کے پاس
مگر نہیں ہے کوئی آہ! اس کا رتبہ شناس

ہے کس کی ذات کا صدقہ یہ نعمتوں کا جہاں!
ملک فریب یہ حوریں یہ دلربا غلماں

یہ کارخانۂ شمع و شرارہ کیوں ہوتے ؟
یہ کاروبارِ سپہر و ستارہ کیوں ہوتے ؟

بیانِ "احسنِ تقویم" کس کی خاطر ہے؟
یہ سلسبیل یہ تسنیم کس کی خاطر ہے ؟

ہیں منتظر تری ویران جنتیں کس کی ؟
ہیں تیری حوروں کے سینے میں دھڑکنیں کس کی؟

تری خلش بھی پلک سے پلک ملا نہ سکی
یہ کس کے شوق میں تجھ کو بھی نیند آ نہ سکی

بلائے گا کبھی پھر کیا کسی کو حیلے سے ؟
ملا تھا کس سے تو معراج کے وسیلے سے ؟

ازل کا تبکدہ جس کی ادا سے حیراں تھا
تجھے بھی اس کی خبر ہے وہ ایک انساں تھا

گلِ وجود کو گلشن کیا تو ہم نے کیا
فضائے دہر کو روشن کیا تو ہم نے کیا

نہ ہوتے ہم تو بجھی رہتی محفلِ امروز
ترا چراغ فرشتے جلاتے کتنے روز؟

صبحِ کاذب

(ساقی جاوید۔ بی۔ اے)

اللہ اللہ یہ وقت کی رفتار،
کتنے سینوں کے داغ جلتے ہیں
آج پھر روم و شام کی تہذیب
دہکے دہکے ہیں منبر و محراب
قصر و ایواں کے جگمگاتے بروج
جاگ اُٹھے ہیں کتنے لات و منات
پھر ابوالہول کا سُلگتا جلال
ناچتا مکر، مُسکراتا دروغ،
ہر حکومت کا آہنی قانون،
جام و مینا میں زہر گھلتے ہیں،
دیدہ و دل ہیں صیدِ میر و امام
اب بھی جلتی ہے ہر دیار میں آگ
اب بھی قایم ہے رسم دار و رسن
جمتی جاتی ہے گرد پھولوں پر

کتنے ماتھوں پہ جم گیا ہے غبار
کتنے خونیں چراغ جلتے ہیں
کھینچتی ہے افق پہ نقشِ صلیب
وقت ہے منکرِ نسیم و گلاب
پھر دکھاتے ہیں زار و جم کا عروج
کھنچ رہا ہے لہو سے خطِ حیات
کر رہا ہے جبینِ وقت کو لال،
دے رہا ہے خباثتوں کو فروغ
چوس لیتا ہے ہر غریب کا خون،
اب بھی نیزوں پہ جسم تلتے ہیں
فکر و دانش ہے مبتلائے جذام
اب بھی لٹتا ہے آشتی کا سہاگ
ہر صداقت پہن چکی ہے کفن،
وقت کا ہاتھ ہے ببولوں پر

کون کہتا ہے رات بیتی ہے
ہم نے ہستی کی جنگ جیتی ہے

(مہر اکبر آبادی۔ بی۔ اے)

بسر کی ہے فراقِ دوست میں یوں زندگی اپنی
کہ مرتے مرتے اُس کی یاد تھی اور بیخودی اپنی
کہو اُن سے نہ دیں تکلیف اب اپنے تبسم کو
کہ رفتہ رفتہ مجھ کو ہو چلی ہے آگہی اپنی
خیالِ دوست بھی آتا ہوا دل میں جھجکتا ہے
اب اس منزل پہ آ پہونچی ہے دور افتادگی اپنی
حیاتِ عشق میں آئے ہیں کچھ لمحات ایسے بھی
کہ تجھ کو بھی نہ پہچانا۔ یہ تھی وارفتگی اپنی
یہ مانا ضبطِ غم سے ہے سکونِ حُسن میں ہلچل
مگر ڈر ہے نہ بن جائے فسانہ خامشی اپنی

نظر یوں ڈالتا پھرتا ہوں میں ایوانِ فطرت پر
کہ جیسے پا رہا ہوں میں ہر اک شے میں کمی اپنی

ت نیاز

حصوں میں)
کے تمام وہ خطوط
نگاری، سلاست
ینی اور البیلے
حاظ سے فن انشاء
پہلی چیز ہیں اور
سامنے خطوط غالب
کے معلوم ہوتے
اڈیشنوں میں پہلے
لطیوں کو دور کیا گیا
تے کے کاغذ پر طباعت
ت ہر حصہ کی چار روپیہ
ادہ محصول

شہناب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخیل اسکی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ غالب کے درجہ تک پہونچتی ہے یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں بھی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بیمثل نمونے نظر آتے ہیں قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:—

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

(۲) ۔۔۔ یں کا مذہب نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت
ایک روپیہ
علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی تازہ ایڈیشن نہایت صحیح و خوشخط، سرورق رنگین

قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

ت ایدہ

باز فتحپوری۔ اس کے ے ایک شخص انسانی شناخت اور اس کی کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے کے مستقبل، سیرت زوال، موت و صحت و بیماری ت و نیکنامی پر صحیح گوئی کر سکتا ہے

قیمت
یک روپیہ
لاوہ محصول

نقاب اٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے قیمت ۸ر علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست، کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت
ایک روپیہ آٹھ آنے
علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے۔

ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر تبصرہ خانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد فنون لطیفہ و حقیقت نگاری قیمت چار روپیہ
علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔

قیمت
ایک روپیہ
ادہ محصول

DNOA 466

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا ازبس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین ا
اور ارباب فکر کے مضامین پر مش
قیمت دو روپیہ علاوہ محصو

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل
کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے
باسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول
اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہئے۔ قیمت دو روپیہ

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و اقتصادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اسمیں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں "مارس ہنڈس" کی ش
کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جسمیں اس نے ای
عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی
زبوں حالی اور انکے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ
ہے کہ انکا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں سالنا
حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جسمیں پہلی جنگ کبھر مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ
کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۱۹۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے اسکا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۱۹۵۳ء

(داغ نمبر) جسمیں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو
گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام
قیام حیدرآباد زمانے کے علاوہ انکی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی
انکے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے قیمت

سالنامہ سنہ ۱۹۵۴ء

(فرمانروایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جسمیں ولادت نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام مسلم
کے عجوبے (یکمران کے اسباب عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل ایک تاریخی کتاب ہے جو
لکھے پڑھے کے پاس ہونا چاہئے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول